نجات

(تقریر ۲۸ دسمبر ۱۹۲۲ء)

از

سیدنا حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد
خلیفۃ المسیح الثانی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

نجات

(تقریر حضرت فضل عمر خلیفۃ المسیح الثانی فرمودہ ۲۸۔ دسمبر ۱۹۲۲ء بر موقع جلسہ سالانہ)

اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَمَّا بَعْدُ۔ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ○ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ○ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ○ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ○[1] اٰمِیْن۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلَاتِھِمْ خَاشِعُوْنَ ○ وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ○ وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِلزَّکٰوۃِ فَاعِلُوْنَ ○ وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِفُرُوْجِھِمْ حٰفِظُوْنَ ○ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِھِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ فَاِنَّھُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ ○ فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْعٰدُوْنَ ○ وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِاَمٰنٰتِھِمْ وَعَھْدِھِمْ رٰعُوْنَ ○ وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَوٰتِھِمْ یُحَافِظُوْنَ ○ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْوٰرِثُوْنَ ○ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ط ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ ○[2]

مضمون کی اہمیت

میرا ارادہ اللہ تعالیٰ کی توفیق اور فضل کے ماتحت آج ایک ایسے مضمون پر بولنے کا ہے جو گو اس مضمون کی اہمیت کو ذاتی طور پر نہیں پہنچ سکتا جس کے متعلق پچھلے سال میں نے تقریر کی تھی یعنی ہستی باری تعالیٰ کے مضمون کو اور اس سے کوئی مضمون بالا ہو ہی نہیں سکتا مگر اس میں بھی شک نہیں کہ وہ مضمون جس کے متعلق میں آج بیان کروں گا وہ ذات باری تعالیٰ کے مضمون کو سمجھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے متعلق اہم مضامین میں سے ایک ہے اور اگر خدا تعالیٰ کو الگ کر کے انسانی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو سب سے بڑا مضمون ہے۔

مسئلہ نجات

وہ مضمون کیا ہے؟ وہ نجات کا مضمون ہے- دراصل انسان کو جو سب سے بڑی چیز مطلوب ہے وہ نجات ہی ہے- دنیا کی وہ چیزیں جو بڑی شاندار نظر آتی ہیں- اگر نجات نہیں تو کچھ بھی نہیں- مشہور ہے جان ہے تو جہان ہے- ایک بیمار جو درد سے تڑپ رہا ہو وہ ستاروں اور جو پر غور کر کے لطف نہیں اٹھا سکتا' وہ سبزہ زار کو دیکھ کر حظ نہیں حاصل کر سکتا' وہ مختلف علوم سے دلچسپی نہیں لے سکتا کیونکہ وہ خود دکھ میں ہے- یہی مضمون ہے جو میرے ان اشعار میں سے ایک میں ادا کیا گیا ہے جو کل پڑھے گئے ہیں- وہ شعر یہ ہے-:

خلق و تکوین جہاں راست پہ سچ پوچھو تو
بات تب ہے کہ مری بگڑی بنائے کوئی

جس کا مطلب یہ ہے کہ میں مانتا ہوں خدا خالق ہے مگر میرے نقطہ خیال سے زمین و آسمان کا بنانا تب ہی فائدہ مند ہے جب کہ میری بگڑی بھی وہ بنا دے- اگر یہ نہیں تو زمین و آسمان کا بنانا مجھ پر اثر نہیں ڈال سکتا-

تو یہ مضمون جو آگے میں بیان کرنے لگا ہوں ہمارے نقطہ نگاہ سے سب سے اہم ہے- میں امید کرتا ہوں کہ احباب اسے غور سے سنیں گے کیونکہ وہ ان کی نجات سے تعلق رکھتا اور نجات کے لئے مفید ہے-

مضمون کا علمی اور عملی پہلو

اس میں شک نہیں کہ جب کسی مضمون کو بیان کیا جاتا ہے تو اس کا علمی پہلو بھی لیا جاتا ہے اور عملی پہلو بھی- علمی پہلو بیان کرنے کی اس لئے ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی مضمون علمی پہلو بیان کرنے کے بغیر مکمل نہیں ہوتا- کسی کام کو کرنے کے لئے کئی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے- ایک تو یہ کہ اس کے کرنے کا شوق ہو- ایک ہی کام کو کئی لوگ کرتے ہیں مگر کچھ ہی لوگ اس میں بڑھتے اور امتیاز حاصل کرتے ہیں- اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جو بڑھتے ہیں ان کو اس کام کے کرنے کا شوق ہوتا ہے اور دوسروں کو نہیں ہوتا- جن کو شوق ہوتا ہے وہ پورے طور پر اس کے کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر دوسرے ایسا نہیں کرتے لیکن شوق علم کی تکمیل سے ہی پیدا ہوتا ہے- دیکھو جس شوق سے ایک کالج کا لڑکا پڑھتا ہے سکول کا لڑکا نہیں پڑھتا- عام طور پر کالج کا لڑکا فارغ پھرتا نظر آتا ہے حالانکہ اس کے کورس کی کتابیں حجم کے لحاظ سے سکول کے لڑکے کی کتابوں سے بڑی ہوتی ہیں مگر وہ شوق کی وجہ سے جلدی علم حاصل کرتا ہے بہ نسبت سکول کے لڑکے کے اس لئے وہ فرصت نکال لیتا ہے-

پس کسی بات کا شوق پیدا کرنے کے لئے چونکہ اس کے علمی پہلو پر روشنی ڈالنا ضروری ہوتا ہے اس لئے میں اس مضمون کے دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالوں گا۔ یعنی اس کا علمی پہلو بھی بیان کروں گا اور عملی بھی۔

درس القرآن کے متعلق اعلان

مگر پیشتر اس کے کہ اصل مضمون شروع کروں ایک بات بتانا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ بھی نجات کا ہی حصہ ہے اور وہ یہ کہ اس سال جو احمدیہ کانفرنس ہوئی تھی اس میں اس سوال پر کہ جماعت کو علم کس طرح پڑھایا جائے میں نے کہا تھا کہ ایک ماہ میں پندرہ پارے قرآن کریم کے پڑھادوں گا اور پھر اگلے سال باقی پندرہ پارے پڑھا کر پڑھنے والوں کو اس بات کے لئے تیار کردوں گا کہ اپنے اپنے مقامات پر درس جاری کر سکیں۔

اس تجویز کے مطابق اس سال سو کے قریب احباب پڑھنے کے لئے آئے تھے۔ یہ تعداد بلحاظ اس کے کہ پہلا سال ہونے کی وجہ سے تیاری کا کم موقع ملا بہت کچھ تسلی کا باعث ہے اور جس شوق سے آنے والوں نے پڑھا ہے وہ ایسا تسلی بخش تھا کہ جس سے بہت ہی خوشی ہوئی۔ میں روزانہ سات گھنٹے کے قریب پڑھاتا تھا۔ اس کے علاوہ صرف و نحو مولوی سرور شاہ صاحب پڑھاتے تھے۔ میر محمد اسحاق صاحب نے بھی ضروری لیکچروں کا سلسلہ شروع کیا ہوا تھا جو روزانہ ہوتے تھے پھر پڑھنے والوں کا روزانہ امتحان لیا جاتا تھا۔ جس کا یہ مطلب ہے کہ انہیں سات گھنٹے سبق پڑھ کر پھر اس کو یاد بھی کرنا ہوتا تھا اور اس کے علاوہ اور مضامین کی بھی تیاری کرنی ہوتی تھی۔ میں نے سنا اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان گرمی کے دنوں میں احباب راتوں کو دیر تک سبق یاد کرتے رہتے تھے۔ اس طرح دس پارے ایک ماہ میں ہو سکے پندرہ نہ ہو سکے مگر میں نے وعدہ کیا ہے کہ آئندہ سال انشاء اللہ بیس پورے کردوں گا۔ اس موقع پر میں نے اس بات کا اس لئے ذکر کیا ہے کہ جلسہ پر آنے والے احباب یہ بات سن لیں اور ابھی سے پڑھنے کی تیاری کرلیں۔ قرآن کریم کے اس طرح پڑھنے سے جس قدر فائدہ ہو سکتا ہے وہ اور طرح نہیں ہو سکتا۔ اور بہت لوگ جو کہتے ہیں کہ قادیان کے روزانہ درس سے ہم فائدہ نہیں اٹھا سکتے ان کے لئے میں نے سال میں ایک مہینہ خاص درس کے لئے رکھ دیا ہے اور اس طرح دو سال کے دو مہینوں میں سارا قرآن ختم کردینے کا انتظام کیا گیا ہے۔ دیکھو اب یہ کتنی آسان بات ہو گئی ہے۔ فی الحال اس درس میں شامل ہونے کے لئے میں زیادہ زور انہیں کے متعلق دیتا ہوں جو اس سال آئے تھے وہ اگلے

سال بھی آئیں - پھر اس سے اگلے سال اور آئیں - میری نیت یہی ہے کہ ہر سال ایک مہینہ اس طرح درس کے لئے رکھا جائے تا کہ اس طرح آہستہ آہستہ ساری جماعت قرآن کریم پڑھ لے -

پھر یہ بھی نیت ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اس درس کو شائع بھی کر دیا جائے اس کے لئے نوٹ لکھ لئے گئے ہیں اور ان کی درستی کا کچھ کام شروع کر دیا گیا ہے - کچھ انشاء اللہ جلسہ کے بعد کروں گا اور اس طرح کچھ حصہ شائع ہو جائے گا مگر اس کے شائع کرنے کا خیال کر کے احباب یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ اس کو پڑھ لیں گے اور یہی ان کے لئے کافی ہو گا - دیکھو قرآن کریم بھی موجود ہے مگر لوگ اس کو پڑھ نہیں سکتے - میرے نوٹ قرآن کریم سے تو بڑھ کر نہیں ہوں گے پھر ان سے پورا پورا فائدہ کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے - بات یہ ہے کہ جو زبانی پڑھانے کا اثر ہوتا ہے وہ کتاب کے پڑھنے سے نہیں ہوتا - پھر زبانی پڑھاتے وقت توجہ اور دعا بھی علم کے ساتھ شامل ہوتی ہے اور یہ اثر کتاب میں کم ہوتا ہے - پھر ذاتی خیالات کا جو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ فلاں آدمی کے لئے کون سے سوال حل کرنے چاہئیں اور فلاں کے لئے کون سے وہ نہیں ہو سکتا - پھر پڑھنے والوں کو جو سوال پیدا ہوتے ہیں وہ پیش کرتے ہیں اور ان کو حل کیا جاتا ہے - ان فوائد کو مدنظر رکھ کر دوستوں کو چاہئے کہ درس میں حاضری میں سستی نہ کریں -

نجات فطرت انسانی میں داخل ہے

اب میں اصل مضمون کی طرف آتا ہوں - پہلی بات نجات کے متعلق یہ ہے کہ نجات فطرت انسان میں داخل ہے اور نجات کی اہمیت اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ یہ فطرت انسانی میں موجود ہے اور فطرت میں وہی مسائل داخل ہوتے ہیں جو نہایت اہم ہوتے ہیں تا کہ ان کے متعلق شریعت یا غیر شریعت کا سوال ہی نہ ہو - جیسے ہستی باری تعالیٰ کا خیال بھی فطرت انسانی میں داخل ہے - جن قوموں میں کوئی الہامی کتاب نہیں پائی جاتی ان میں بھی یہ خیال پایا جاتا ہے اور دنیا کی کوئی قوم اس خیال سے خالی نہیں ہے - پس اہم امور ہی فطرت میں رکھے جاتے ہیں -

نجات کے فطرت میں ہونے کا ثبوت

اب یہ سوال کہ فطرت میں کس طرح نجات رکھی ہوئی ہے؟ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جس قدر مذاہب ہیں ان کے پیروؤں میں نجات کا خیال کسی نہ کسی رنگ میں پایا جاتا ہے - جس طرف جس گوشہ میں چلے جاؤ خدا تعالیٰ کی ہستی کا خیال پایا جاتا ہے - حبشیوں میں چلے جاؤ تو ان میں بھی یہ خیال موجود ہے - آسٹریلیا میں چلے جاؤ تو وہاں کے قدیم باشندوں میں بھی یہ خیال پایا جاتا ہے اور میں نے

تمام دنیا کے گوشوں کی کتابیں اس بات کو مد نظر رکھ کر پڑھی ہیں کہ آیا کوئی علاقہ ایسا ہے جہاں خدا تعالیٰ کے ماننے کا خیال نہیں تو مجھے یہی معلوم ہوا ہے کہ سب جگہ ہے۔

نجات کا خیال تمام انسانوں میں پایا جاتا ہے

اسی طرح تمام علاقوں میں نجات کا خیال پایا جاتا ہے۔ عیسائیوں کا تو مدار ہی اسی مسئلہ پر ہے۔ ہندوؤں میں جاکر دیکھو تو وہ اسے مکتی اور موکش کہتے ہیں اور اسے ضروری مانتے ہیں۔ یہودی مذہب کی کتابیں جب پڑھتے ہیں تو بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ نجات ضروری ہے انسان کو چاہئے کہ اسے حاصل کرے۔ گو نجات کا لفظ جو عربی ہے وہ نہ ہو مگر اس قسم کے الفاظ کہ خدا کے غضب سے بچنا چاہئے اور اس کا قرب حاصل کرنا چاہئے ضرور پائے جاتے ہیں۔ [۳] پھر ایرانیوں اور زرتشتیوں کی کتابوں میں بھی یہی پایا جاتا ہے۔ پھر نہایت پرانے مذاہب یعنی مصری اور جاپانی وغیرہ لوگوں میں بھی نجات کا مسئلہ پایا جاتا ہے۔ سات سات ہزار سال کے پرانے آثار ملے ہیں ان سے پتہ لگا ہے کہ وہ لوگ مردوں کے ساتھ کھانے پینے کی چیزیں اور قیمتی اشیاء اس لئے رکھ دیا کرتے تھے کہ وہ عذاب سے بچ جائیں۔ گویا نجات کا خیال ادنیٰ سے ادنیٰ مذاہب میں بھی پایا جاتا ہے۔

نجات کا خیال خدا کے خیال سے زیادہ پھیلا ہوا ہے

مگر عجیب بات یہ ہے کہ جب اور تحقیقات کرتے ہیں تو خدا تعالیٰ کے وجود کے خیال سے بھی اس کو آگے نکلا ہوا پاتے ہیں کیونکہ بعض ایسی قومیں ہیں جنہوں نے خدا کو چھوڑ دیا ہے مگر نجات کو مانتی ہیں کہ یہ ضروری ہے۔ چنانچہ ہندوؤں میں بدھ اور جینی ایسی ہی قومیں ہیں۔ بدھ پہلے خدا کے قائل تھے مگر موجودہ بدھ نہیں وہ کہتے ہیں ہمیں نہ یہ پتہ ہے کہ خدا ہے اور نہ یہ کہ خدا نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں اس سے کچھ واسطہ نہیں کہ خدا ہے یا نہیں اصل بات یہ ہے کہ نجات حاصل کرنی چاہئے۔ گویا انہوں نے خدا کو چھوڑ دیا مگر نجات کو نہیں چھوڑا کیونکہ یہ بات ان کے اپنے دکھوں سے تعلق رکھتی ہے۔

ان سے بڑھ کر جینی ہیں۔ وہ صاف طور پر کہتے ہیں کہ خدا کوئی نہیں ہے مگر وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ انسانی روحوں کا سب سے بڑا مقصد نجات حاصل کرنا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نجات فطرت کا مسئلہ ہے اور ایسے متفقہ طور پر لوگ اسے مانتے ہیں کہ کسی حالت میں ان سے یہ الگ نہیں ہو سکتا۔ پس جب کہ اس کے متعلق ایسی تڑپ لگی ہوئی

ہے کہ چاہے کوئی خدا کو بھی مانے یا نہ مانے مگر اس کو ضرور مانتا ہے تو پھر جو قوم خدا کو بھی مانتی ہو اس کی اس کے حصول کے لئے کتنی ذمہ داری ہے؟

اس زمانہ میں دیو سماجی ایک فرقہ ہے۔ وہ دہریہ ہیں مگر وہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ انسانی روح ترقی کر جاتی اور اعلیٰ مراتب حاصل کر لیتی ہے۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ یورپ کے دہریہ بھی نجات کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ وہ کسی مذہب کے قائل نہیں مگر وہ بھی کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد روح ترقی کرتی ہے اس کے لئے کوشش کرنی چاہئے تاکہ مرنے کے بعد روح آرام حاصل کرے۔ وہ نجات کی تعریف مختلف کرتے ہیں مگر یہ سب مانتے ہیں کہ ہم نجات میں نہیں ہیں اسے حاصل کرنا چاہئے۔

بدھ کی نجات کے لئے کوشش

پرانے زمانے میں نجات کے لئے جو کوششیں کی گئی ہیں ان میں سے ایک عجیب واقعہ ہے جو طبیعت پر بڑا اثر کرتا ہے۔ اور وہ بدھ کا واقعہ ہے بدھ کے معنی ہیں جاگا ہوا اور نیند سے اٹھ بیٹھا۔ لکھا ہے کہ بدھ راجہ کا بیٹا تھا نجومیوں نے اس کے متعلق کہا کہ یا تو یہ بڑا معلم ہوگا یا بڑا بادشاہ ہوگا۔ (یاد رکھنا چاہئے کہ ایسے واقعات میں بہت سی جھوٹی باتیں بعد میں مل جاتی ہیں)۔ اس کے باپ نے سوچا کہ میرا یہی ایک بیٹا ہے میں اس کو معلم نہ بننے دوں بلکہ یہ بادشاہ بنے۔ اس کے لئے اس نے نجومیوں سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ اس کو ایسے لوگوں سے ملنے نہ دو جن کا رجحان علم کی طرف ہو۔ اس پر اس کے باپ نے ایک قلعہ بنایا اور اس میں ایسے نوکر رکھے جو ہر وقت خوش و خرم رہیں۔ ان میں سے اگر کوئی بیمار ہو جاتا تو اس کو ہٹا دیا جاتا۔ اسی طرز پر اس کی پرورش کی اور کوئی غمناک بات اس کے سامنے نہ ہونے دی حتّٰی کہ وہ جوان ہو گیا اور اس وقت تک اسے کبھی دکھ کا پتہ نہ لگنے دیا گیا (یہ تو مبالغہ ہے اگر دوسروں کے دکھ اسے معلوم نہ ہونے دیئے۔ تو کیا اس عرصہ میں اسے خود بھی کوئی دکھ اور تکلیف نہ ہوئی ہوگی؟) آخر کہتے ہیں کہ اس نے اپنے باپ کو کہا کہ میں اندر رہتے رہتے تنگ آگیا ہوں اور باہر نکلنا چاہتا ہوں۔ باپ نے اس کی بات کو مان لیا مگر نوکروں سے کہا کہ اسے شہر میں نہ لاؤ شہر کے باہر باہر ہی پھیراؤ۔ ایک امیر اس کی رتھ ایک سڑک پر لے گیا مگر عجیب بات یہ ہوئی کہ ایک بیمار مسافر اسی سڑک پر بیٹھا تھا جس کو لوگ شہر میں نہ رہنے دیتے تھے وہ اس کو ملا۔ اس نے پوچھا یہ کون ہے؟ پہلے تو ٹالنے کی کوشش کی گئی مگر اس کے اصرار پر آخر بتایا گیا کہ یہ ایک بیمار ہے جسے شہر سے نکالا گیا ہے۔ یہ بات سن کر اس پر اتنا اثر ہوا کہ وہ وہیں سے واپس

گھر چلا گیا (معلوم ہوتا ہے یہ خدا تعالیٰ کا ہی انتظام تھا ورنہ اگر اسے عام طور پر مصیبت زدہ لوگوں سے ملنے دیا جاتا تو اس پر اس قدر اثر نہ ہوتا) پھر دوسری دفعہ اس نے باہر جانے کی اجازت حاصل کی اور باہر گیا اس دفعہ اس نے ایک اندھا دیکھا اس سے بھی وہ بہت متأثر ہوا اور دیر تک سوچتا رہا۔ اسی طرح وہ پھر باہر گیا اور پھر کوئی اور مصیبت زدہ دیکھا۔ آخر ایک دن اس نے دیکھا کہ ایک سنیاسی جا رہا ہے اس سے پوچھا تو کون ہے اور کہاں جاتا ہے؟ اس نے کہا میں سنیاسی ہوں اور نجات حاصل کرنے کے لئے جا رہا ہوں۔ دنیا میں جو دکھ ہوتے ہیں ان سے بچنے کے لئے دنیا کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اس نے کہا کیوں نہ میں بھی ان دکھوں سے بچنے کے لئے کوشش کروں۔ اس کے متعلق کچھ عرصہ تک وہ سوچتا رہا۔ آخر اس کے گھر بچہ پیدا ہوا۔ اس کا اس پر یہ اثر ہوا کہ اس نے کہا پہلے تو مجھ پر ہی دکھ تھے اب اس بچہ پر بھی ہوں گے۔ اسی دن اس نے نوکر کو ایک گھوڑا تیار کرنے کے لئے کہا اور سوتی ہوئی بیوی اور بچے کو پیار کر کے گھر سے باہر نکل گیا۔ باہر آکر گھوڑا نوکر کو دے دیا اور کہا جا میرے باپ کو کہہ دے کہ میں نجات کی تلاش کو جاتا ہوں۔ وہاں سے چل کر وہ ایک جگہ جس کا نام راجہ گرہی تھا آیا۔ یہ ایک مشہور جگہ تھی وہاں بڑے بڑے عالم اکٹھے ہوئے ہوئے تھے وہاں اس نے دیکھا کہ ایک پہاڑی پر کچھ برہمن اپنے اپنے علم پڑھاتے ہیں۔ ایک برہمن سے وہ فلسفہ پڑھنے لگا۔ پڑھتے پڑھتے آخر اس نے کہا کہ یہ برہمن باتیں تو بہت کرتا ہے مگر مجھے نجات تو نہ ملی ان باتوں کا مجھے کیا فائدہ ہے۔ اس پر اس نے استاد کو کہہ دیا کہ میں اب تجھ سے نہیں پڑھتا اور ایک اور کے پاس چلا گیا وہ صوفی منش آدمی تھا خود عبادت کرتا اور دوسروں کو کراتا تھا۔ اس کے پاس رہنے لگا اور عبادت کے طریق سیکھے اور پھر اور ساتھیوں کو لے کر جنگل میں جا کر عبادتیں کرنے لگ گیا۔ اس قدر عبادتیں اور فاقے کئے یعنی روزے رکھے کہ آخر ایک دن بیہوش ہو کر گر گیا۔ ایک زمیندار عورت ادھر سے جا رہی تھی وہ اسے اٹھوا کر لے گئی اور جا کر خدمت کی۔ آخر اسے ہوش آئی اور اس نے سوچنا شروع کیا کہ میں نے فلسفہ پڑھا مگر نجات نہ ہوئی۔ میں نے عبادت کی مگر نجات نہ ہوئی۔ کہتے ہیں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے دل کی کھڑکی کھلی۔ یہ الہام تھا جو اسے ہوا اس میں اسے بتایا گیا۔ کہ ایک درمیانہ راستہ ہے اور اس میں نجات ہے۔ آخر اس کو تسلی ہو گئی اور اس طرح اس نے نجات کے لئے کوشش کی۔ (دراصل وہ نبی تھا اور خدا تعالیٰ کا قائل تھا حضرت مسیح موعودؑ کی تحریروں سے یہی معلوم ہوتا ہے) اس کا یہ واقعہ بہت ہی اثر انگیز ہے کہ کس طرح اس کے دل میں نجات کے لئے تڑپ پیدا ہوئی اور اس کے

لئے اس نے کیا کیا کوششیں کیں۔

رسول کریمؐ کے نبوت سے پہلے حالات

رسول کریم ﷺ کی زندگی کے حالات نبوت کے بعد کے تو مصنفوں نے لکھے ہیں لیکن افسوس کہ نبوت سے پہلے کے حالات نہیں لکھے۔ اگر وہ حالات لکھتے تو معلوم ہوتا کہ کس طرح آپؐ کے دل میں تڑپ تھی اور آپؐ کس طرح عبادتیں کرتے تھے اور نہ معلوم ان حالات کا کتنا بڑا اثر ہوتا۔ یہ شکوہ ہے مجھے پرانے مصنفوں پر کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ کے پہلے حالات نہ لکھے۔

نجات کیا ہے؟

غرض نجات کا مسئلہ فطری مسئلہ ہے اور ہر شخص چاہتا ہے کہ نجات حاصل کرے مگر سوال یہ ہے کہ نجات کیا چیز ہے؟ عجیب بات ہے کہ جس طرح ساری دنیا کے فرقوں کا اس امر پر اتحاد ہے کہ کسی چیز سے بچنا چاہئے یعنی نجات حاصل کرنی چاہئے اسی طرح اس امر میں سب کو اختلاف ہے کہ نجات ہے کیا؟ اس سے ایک عظیم الشان بات معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ نجات فطری امر ہے مگر اس کا بتانا الہام کے ذریعہ ہی ممکن ہے اور جو سچا الہام پائے گا وہی نجات کی صحیح تعریف بتائے گا باقی لوگ غلط خیالات دوڑائیں گے۔

اب میں یہ بتاتا ہوں کہ لوگ نجات کے متعلق کیا کیا غلط خیالات دوڑاتے ہیں۔

برہمنوں کے نزدیک نجات کی تعریف

برہمنوں نے کہا ہے کہ نجات یہ ہے کہ سکھ دکھ سے انسان بچ کر خدا میں جذب ہو جائے یعنی اس میں شامل ہو جائے۔ ان کے نزدیک آرام بھی ایک کمزوری ہے اور کمزوری کی وجہ سے آرام کا احساس ہوتا ہے۔

بدھوں کے نزدیک نجات کی تعریف

بدھوں کے نزدیک نجات بالکل اور ہے۔ بدھ اس بات کے قائل ہیں کہ دنیا میں جو دکھ ہیں ان سے انسان کو بچنا چاہئے۔ وہ کہتے ہیں جونوں میں پڑنے سے چھٹ جانا اور خواہشات کا مٹ جانا نجات ہے۔ پھر وہ کہتے ہیں ہر ایک خواہش دوزخ ہے اور یہی جونوں کو پیدا کرتی ہے جب یہ نہیں رہتی تو انسان جونوں میں نہیں آتا اور یہی نجات ہے۔

جینیوں کے نزدیک نجات کی تعریف

جینیوں کے نزدیک نجات یہ ہے کہ انسان جونوں سے چھٹ کر اعلیٰ طاقتیں حاصل کرلے۔ وہ خدا

کے قائل نہیں۔ ان کے نزدیک نجات یہ ہے کہ روح جونوں سے بچ جائے اور پھر اعلیٰ طاقتیں پیدا کر کے خدا کی مثل ہو جائے۔

یہودیوں کے نزدیک نجات کی تعریف یہودیوں کے نزدیک بعد الموت عذاب سے چھٹ جانا یا اسی دنیا میں یہوواہ کا عذاب نہ دینا نجات ہے۔ وہ یہوواہ خدا کو کہتے ہیں۔

مسیحیوں کے نزدیک نجات کی تعریف مسیحیوں کے نزدیک گناہ کی سزا سے بچ جانا اور گناہ سے بچ جانا نجات ہے۔

زرتشتیوں کے نزدیک نجات کی تعریف زرتشتیوں کے نزدیک گناہ کی سزا سے بچ جانا نجات ہے۔ وہ کہتے ہیں جب انسان گناہ کی سزا سے بچ گیا تو اس کی نجات ہو گئی۔

شنٹوازم کے نزدیک نجات کی تعریف شنٹو ازم یعنی جاپان کا اصل مذہب ان کے نزدیک گناہوں کی سزا سے بچنا نجات ہے۔ یہ چونکہ بہت قدیم مذہب ہے اس لئے اس کی پوری تاریخ معلوم نہیں ہو سکتی مگر ان میں رسم ہے کہ مسلمانوں کی طرح قضاء عمری ادا کرتے ہیں۔ ہاں ایک فرق ہے کہ مسلمان ایک دفعہ ادا کرتے ہیں اور یہ دو دفعہ۔ اس سے پتہ لگتا ہے کہ وہ گناہوں کی سزا سمجھتے ہیں ورنہ قضاء کیوں ادا کرتے۔

جدید فلسفہ یورپ کے نزدیک نجات کی تعریف جدید فلسفہ یورپ کے نزدیک نجات یہ ہے کہ انسان جہالت سے بچ جائے وہ کہتے ہیں انسانی روحیں کوشش کر رہی ہیں کہ جہالت سے نکل جائیں اسی لئے زمانہ ترقی کرتا جا رہا ہے۔

اسلام کے نزدیک نجات کی تعریف اسلامی نجات کے متعلق چونکہ آگے بحث ہو گی اس لئے یہاں بیان نہیں کی جاتی۔

کیا بنی نوع کا مقصد نجات ہے یا اس سے بڑھ کر؟ اب اس امر پر بحث کی جاتی ہے کہ کیا نجات بنی نوع کا مقصد ہے یا اس سے بھی بڑھ کر کوئی اور مقصد ہے جس کی تلاش کرنی چاہئے۔ میں جب قرآن کریم کو دیکھتا ہوں تو مجھے نجات پر اتنا زور نظر نہیں آتا جتنا ایک اور امر پر اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ

اسلامی نقطہ نگاہ کی رو سے نجات ادنیٰ ہے اور وہ مقصد اعلیٰ۔ وہ کیا ہے؟ وہ وہی ہے جو ان آیات میں بتایا گیا ہے جو میں نے ابتداء میں پڑھی ہیں یعنی فلاح۔ اسلام کہتا ہے اصل کامیابی بچ جانا نہیں اور تکلیف اور دکھ سے بچ جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ فلاں بڑا بہادر جرنیل ہے جو دشمن سے بچ کر بھاگ آیا۔ بھاگ آنا بھی کسی موقع پر اچھی بات ہوتی ہے مگر اس سے اعلیٰ بات یہ ہے کہ دشمن کو پکڑ بھی لے۔

اسلام نجات کی بجائے فلاح بتاتا ہے اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ صرف نجات کے حصول کی کوشش نہ کرو بلکہ فلاح کے لئے کوشش کرو اور نجات اسی میں آجاتی ہے۔ کیونکہ جب انسان دشمن کو مار کر اس پر کامیابی حاصل کر لے گا تو اس کے حملے سے بھی بچ جائے گا۔ ایک ایسا شخص جس کو بھوک نہیں وہ اس کی تکلیف سے بچا ہوا ہے۔ مگر ایک ایسا شخص جس نے ایسا کھانا کھایا جس سے جسم نے طاقت حاصل کی تو وہ بھوک سے بھی بچا ہوا ہوگا۔ تو کامیابی میں نجات آپ ہی آجاتی ہے اسی لئے اسلام نے انسان کا اصل مقصد فلاح کو قرار دیا ہے۔ ہاں کبھی کبھی نجات کا لفظ فلاح کے لئے بولتے ہیں عام محاورہ کی وجہ سے کیونکہ عام لوگ نجات ہی کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ پس نجات فلاح کے نیچے کا درجہ ہے اور جس کو فلاح حاصل ہو گئی اسے نجات بھی حاصل ہو گئی کیونکہ جو شخص تین سیڑھیاں چڑھ گیا وہ دو آپ ہی چڑھ گیا۔

فلاح کیا ہے؟ اب میں بتاتا ہوں کہ فلاح کیا ہے؟ میں نے اسلام کی نجات کی تعریف نہیں کی کیونکہ اسلام فلاح کو پیش کرتا ہے نجات کو پیش نہیں کرتا اس لئے میں اب فلاح کی تعریف کرتا ہوں۔

اسلام کے نزدیک فلاح یا دوسرے لفظوں میں نجات کیا ہے؟ اسلام کہتا ہے۔ یہ نجات نہیں کہ تم دوزخ کی سزا سے بچ جاؤ گے بلکہ انسان جس غرض کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس کو حاصل کر لینا فلاح ہے اور چونکہ انسان اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ خدا سے ملے اس لئے نجات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے ملنے کی جو تڑپ اور آگ انسان کے دل میں لگی ہوئی ہے اس سے بچ جائے اور خدا تعالیٰ سے مل جائے۔ انسان کے اندر ایک تڑپ رکھی گئی ہے اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى [۴] میں جس کی طرف اشارہ ہے۔ اس تڑپ کا پورا ہو جانا اور اس سے بچ جانا نجات ہے۔ اس تڑپ سے انسان بچ کس طرح سکتا ہے؟ جس طرح عاشق معشوق سے مل کر ہی تڑپ سے بچ سکتا ہے نہ کہ

کسی اور طرح سے اسی طرح خدا تعالیٰ کو مل کر نجات ملتی ہے۔

اسلامی فلاح اور ہندوؤں کی نجات میں فرق

یہاں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے اور شاید بعض لوگوں کو پیدا ہوا ہو کہ کیا نجات کی یہ تعریف ہندو مذہب کی نجات سے تو نہیں ملتی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہندو مذہب نجات کی جو تعریف کرتا ہے وہ فلاح نہیں ہو سکتی کیونکہ ہندوؤں کے نزدیک خدا کا ملنا یہ ہے کہ انسان میں کوئی حس نہ رہے۔ مگر فلاح کے معنی ہیں لے لیا اور پالیا اور اس کے لئے حس کی ضرورت ہے کیونکہ جس نے حس کھو دی اس نے تو سب کچھ کھو دیا نہ کہ کچھ پایا اس لئے ہندو مذہب جس امر کو نجات قرار دیتا ہے وہ فلاح نہیں کہلا سکتی۔ فلاح وہ ہے جو اسلام نے پیش کی ہے کہ سب کچھ پالیا۔ ہندو مذہب کی نجات تو ایسی ہے کہ کوئی شخص بیمار ہو اور مرجائے تو کہے لو تکالیف سے چھٹی ہوئی۔ یہ ہندوؤں کے نزدیک نجات ہے مگر ہم یہ نہیں کہتے کیونکہ یہ تو مٹ جانا ہے نہ کہ کچھ حاصل کرنا ہم نجات اس کو کہتے ہیں کہ انسان کے اندر خدا کی طاقتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ خدا کی صفات جلوہ گر ہوتی ہیں اور اسے دائمی حیات دے دیتی ہیں۔ یہ دائمی نجات ہے فنا نہیں۔

اب آپ لوگوں نے اسلامی نجات کی تعریف سمجھ لی ہوگی اور یہی سب سے اعلیٰ نجات ہے۔

نجات کی اقسام

اب میں یہ بتاتا ہوں کہ نجات کی کتنی اقسام ہیں؟ :-

پہلی قسم کی نجات

نجات کی ایک پہلی قسم ہے جسے ادنیٰ کہنا چاہئے اور وہ دنیاوی عذاب سے نجات ہے۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پانچ قسم کی نجات ہے۔

(۱) جسمانی عذاب سے نجات۔ یعنی ایسی تکلیفوں سے بچ جانا جن کا اثر جسم انسانی پر پڑتا ہے جیسے بیماریاں وغیرہ (۲) دوسری نجات قرآن کریم سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ مالی مشکلات سے بچ جانا۔ (۳) تیسری نجات قرآن کریم سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ عَذَابَ الْهُوْنِ۔ [۵] یعنی ذلت اور رسوائی کا عذاب جس میں انسان کی عزت پر حملہ ہوتا ہے اس سے بچ جانا۔ (۴) چوتھی نجات قرآن کریم سے حسرات کے عذاب سے بچ جانا معلوم ہوتی ہے یعنی احساسات کے عذاب سے بچنا۔ اس میں اور عزت کے متعلق عذاب میں فرق یہ ہے کہ اس میں انسان اپنے خلاف ایک بات دیکھتا ہے مگر اس کو مٹا نہیں سکتا اور اپنے آپ کو بے بس پاتا ہے۔ جیسا کہ آتا ہے یَوْمَ یَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰی

یَدَیْہِ[6] -(۵) پانچویں نجات خیالات کی پراگندگی کے عذاب سے بچنا ہے - ایسا انسان کسی بات پر قائم نہیں رہ سکتا - کوئی تکلیف اس کو نہیں ہوتی مگر اس کے خیالات میں اجتماع نہیں ہوتا -

دوسری قسم کی نجات دوسری قسم کا عذاب بد عقائد یا ضمیر کا عذاب ہے یعنی ضمیر انسان کو ملامت کرتی ہے - ایک بات پر وہ قائم ہوتا ہے اور کہتا ہے یہ یوں ہے مگر اندر سے ضمیر اسے کہتی ہے تو جھوٹ بول رہا ہے - یہ ضمیر کا عذاب ہے اس سے بچ جانا دوسری قسم کی نجات ہے -

تیسری قسم کی نجات تیسری قسم کا عذاب قرآن کریم سے گناہ یا بد اعمال کا عذاب معلوم ہوتا ہے - اس سے بچ جانا تیسری قسم کی نجات ہے -

چوتھی قسم کی نجات چوتھی قسم کا عذاب میلان گناہ کا عذاب ہے - ایک انسان عملاً گناہ نہیں کرتا مگر اس میں میلان گناہ ہوتا ہے - یا اس کا دل اس قدر مر چکا ہوتا ہے کہ اسے گناہ میں لذت آنے لگتی ہے - یہ میلان گناہ کا عذاب ہے اس سے بچ جانا بھی نجات ہے -

پانچویں قسم کی نجات یہ ہے کہ گناہ کے طبعی نتائج سے انسان بچ جائے - طبعی سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کو لاٹھی مارتا ہے اس کے دو نتیجے نکلیں گے ایک تو یہ کہ دوسرا شخص اس سے لڑے گا اور ایک یہ کہ اس کے ہاتھ کی ورزش ہوگی یہ طبعی نتیجہ ہے - تو گناہ کے طبعی نتیجہ سے بچ جانا نجات ہے - یعنی انسان ایک گناہ کرتا ہے پھر اس سے آگے گناہ کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے اس سے بچ جاتا ہے -

چھٹی قسم کی نجات یہ ہے کہ انسان گناہ کے شرعی نتیجہ سے بچ جائے مثلاً اس نے چوری کی اور خدا نے کہا اس کا بیٹا مر جائے - یہ شرعی سزا ہے ورنہ چوری کرنے سے بچے کے مرنے کا تعلق نہیں -

ساتویں قسم کی نجات یہ قسم نجات کی اصل ہے اور باقی اس کی شاخیں ہیں اور وہ یہ ہے کہ بُعدِ الٰہی سے انسان نجات پا جائے - خدا تعالیٰ کے ملنے کی جو خواہش اس کے دل میں ہے وہ پوری ہو جائے -

اس نجات میں سب قسم کی نجاتیں آجاتی ہیں جیسے کہتے ہیں ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں اسی طرح اس نجات میں سب نجاتیں شامل ہیں - اسی درجہ میں جا کر انسان شک کے عذاب سے

نجات پا جاتا ہے کیونکہ جب انسان نے خدا کو دیکھ لیا تو ہر قسم کا شک و شبہ دور ہو گیا۔

کیا نجات ممکن ہے؟

یہ سات اقسام نجات کی ہیں۔ اب میں یہ بتاتا ہوں کہ کیا نجات ممکن ہے؟ یہ سوال انسانی نقطہ نگاہ سے ایک بڑا اہم سوال ہے کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ اس سوال کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو تو یہ ہے کہ کیا نجات اس دنیا میں ممکن ہے؟ دوسرا پہلو یہ ہے کہ کیا نجات کسی وقت بھی ممکن ہے؟ پہلے سوال کا جواب ہندو نقطہ خیال سے نفی میں ہے کیونکہ جب وہ جون میں آنے کو عذاب کہتے ہیں تو ان کے نزدیک اس دنیا میں نجات کیسی؟ پھر اس لحاظ سے بھی ان کا جواب نفی میں ہے کہ وہ نجات کہتے ہیں دکھ سکھ سے بچ جانے کو مگر یہ تو اس دنیا میں لگے ہی رہیں گے اس لئے ان کے خیال کی رو سے اس دنیا میں نجات بھی نہیں ہو سکتی۔

بدھ نقطہ نگاہ سے بھی اس دنیا میں نجات ناممکن ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں اس جسم سے چھوٹ جانا نجات ہے۔ اسی طرح جینی کہتے ہیں اس لئے ان کے لحاظ سے بھی اس دنیا میں نجات ناممکن ہے۔

زرتشتی نقطہ نگاہ سے اس کا یہ جواب ہو گا کہ یہ سوال ہی عبث ہے کیونکہ نجات تو آخرت کے عذاب سے بچنے کا نام ہے۔

یہودی نقطہ نگاہ سے یہوواہ کے عذاب سے اس جہان میں بچ جانا ممکن ہے۔

مسیحی نقطہ نگاہ سے نجات کا ایک حصہ اس دنیا میں مل سکتا ہے اور ایک نہیں۔ جو حصہ اس دنیا میں مل سکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ انسان گناہ سے بچ جائے اور دوسرا حصہ یہ ہے کہ گناہ کے نتیجہ سے بچ جائے۔ یہ آگے جا کر ہو گا۔

اسلام کے نزدیک بھی اس کے دو جواب ہوں گے۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے فلاح کی کئی تعریفیں ہیں ان میں سے کچھ اس دنیا سے تعلق رکھتی ہیں اور کچھ آئندہ سے۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ جتنی باتیں اس دنیا سے تعلق رکھتی ہیں وہ اس دنیا میں حاصل ہو سکتی ہیں اور جو اگلے جہان سے تعلق رکھتی ہیں وہ وہاں جا کر حاصل ہوں گی۔

سوال دوم کا جواب یہ ہے کہ سارے مذاہب کہتے ہیں کہ نجات ممکن ہے۔ یہاں پھر سب مذاہب کا اتحاد ہو گیا۔

اب میں تفصیلی طور پر بیان کرتا ہوں۔ کہ اسلامی نقطہ نگاہ سے نجات کس کس چیز سے ہو سکتی ہے۔

(۱) کیا دنیوی عذاب سے نجات مل سکتی ہے؟

ہندوستانی نقطہ نگاہ سے (اس سے مراد جینی - بدھ - ہندو وغیرہ ہیں) نہیں ہو سکتی کیونکہ جب تک انسان جون میں ہے وہ عذاب میں رہے گا۔

یہودی اور عیسائی نقطہ نگاہ سے ہو سکتی ہے مگر اسلام نے اس میں اور بھی وسعت دی ہے اور الگ الگ بتایا ہے کہ دنیا میں دو قانون جاری ہیں۔ ایک طبعی۔ مثلاً پانی پیا اور پیاس بجھ گئی اور ایک شرعی کہ خدا کا عذاب کسی رنگ میں ظاہر ہو۔

اسلام کہتا ہے کہ طبعی قانون کے مطابق جو تکالیف انسان کو پہنچتی ہیں وہ عذاب نہیں کیونکہ عذاب میں خدا تعالیٰ کی ناراضگی داخل ہوتی ہے مگر طبعی تکالیف میں خدا کی ناراضگی شامل نہیں ہوتی اس لئے وہ عذاب ہی نہیں بلکہ وہ انسان کے لئے ضروری ہیں جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گا۔

طبعی تکالیف کیوں آتی ہیں؟

اسلام کہتا ہے (۱) طبعی تکالیف انسان میں مدارج پیدا کرنے لئے آتی ہیں پس جبکہ وہ تکالیف عذاب ہی نہیں تو ان سے نجات کیسی؟ وہ تو مدارج میں ترقی کے لئے آتی ہیں۔ اگر وہ تکالیف نہ ہوتیں تو انسان میں مدارج بھی نہ ہوتے۔ مثلاً سارے انسان محنتیں کرتے ہیں اگر ان کی محنتوں میں فرق نہ ہوتا تو پھر ان کے مدارج کا فرق کس طرح ہوتا؟ ایک عالم ہے اور ایک جاہل۔ یہ مدارج کیوں ہیں؟ ان تکالیف کی وجہ سے ہی تو معلوم ہوا کہ دنیاوی تکالیف عذاب نہیں۔ جس قدر کوئی زیادہ تکالیف اٹھاتا ہے اسی قدر لوگ اسے بڑا بناتے ہیں پس بعض تکالیف مدارج کی ترقی کے لئے آتی ہیں۔

(۲) بعض تکالیف طبعی احکام کی خلاف ورزی کی وجہ سے آتی ہیں اور عذاب شرعی احکام کی خلاف ورزی کی سزا کو کہتے ہیں۔ یہ کوئی نہ کہے گا کہ اگر کوئی زیادہ کھانا کھالے تو وہ ایک اور جون میں ڈالا جائے گا۔ پس جب طبعی قانون کی خلاف ورزی عذاب نہیں تو اس کے لئے نجات بھی نہیں۔

(۳) عذاب وہ ہوتا ہے جس سے انسان بچنا چاہتا ہے مگر بعض طبعی تکالیف تو ایسی ہوتی ہیں کہ خود انسان ان کو چاہتا ہے۔ جیسے ماں بچہ کو لے کر رات کو کھڑی رہتی ہے اس کو کہو کہ سو جا تو اگر وہ مہذب نہیں تو جھاڑو لے کر پیچھے پڑ جائے گی کہ مجھے بچہ کو آرام پہنچانے سے روکا جاتا ہے یا دیکھو مجمعوں میں لوگوں کو تکالیف پہنچتی ہیں۔ یہاں ہی دیکھ لو کس طرح پچکے جاتے ہیں۔ کیا اس وجہ

سے بھاگ جاتے ہیں؟ پس عذاب وہ ہوتا ہے جس کو انسان ہٹانا چاہتا ہے مگر دنیا کی بہت سی ایسی تکلیفیں ہیں کہ جن کو انسان خود لینا چاہتا ہے اور ان سے ہٹنا نہیں چاہتا۔ کسی موجد سے کہو تم کیوں مصیبت میں مبتلاء ہو تکالیف اٹھا کر ایجادیں کر رہے ہو؟ کیا اس بات سے وہ محنت کرنا چھوڑ دے گا؟ ہرگز نہیں بلکہ چھڑانے کی تحریک کرنے والے کو جاہل کہے گا کیونکہ اس کو اس تکلیف میں بھی مزا آ رہا ہوتا ہے۔ جب یہ صورت ہے تو پھر طبعی تکالیف کو عذاب کس طرح مان لیا جائے۔ پس ان کو عذاب نہیں کہہ سکتے۔

ایک اعتراض کا جواب

اس جگہ ایک اعتراض پڑ سکتا ہے اور وہ یہ کہ یہ بھی تو عذاب ہے کہ کاموں میں کامیابی کے حصول کے لئے تکلیف رکھ دی گئی ہے اور چونکہ کام کرنے ضروری ہیں اس لئے انسان ان تکالیف کو بھی بُھگت رہا ہے۔ مگر یہ اعتراض درست نہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ اگر یہ دقتیں اور تکلیفیں نہ ہوتیں تو محبتیں بھی نہ ہوتیں۔ اگر ماں کو بچہ کی پرورش کی تکلیف نہ ہوتی تو ان میں محبت بھی نہ ہوتی۔ پس یہ تکالیف تو محبت اور موانست کے بڑھانے کے لئے ہیں۔

پھر اگر علم کے حصول میں محنت نہ ہوتی تو لوگوں کے مختلف مدارج کس طرح ہوتے؟ مارکونی [7] اور ایڈیسن [8] کو جو شہرت حاصل ہے وہ کس طرح ہوتی؟ ایک چوہڑہ بھی ایسا ہوتا جیسے وہ ہوتے۔ پھر اگر زندگی کو دیکھا جائے تو یہ نام ہی ہے چند تکالیف کے اٹھانے اور ان سے ثمرات حاصل کرنے کا۔ پس جس چیز کا نام زندگی ' مزا اور لطف ہے اس کو عذاب کس طرح کہا جا سکتا ہے؟ پس وہ تکالیف ہیں۔ مگر عذاب نہیں ہیں۔

پھر بعض دنیاوی تکالیف شرعی قانون کے ماتحت آتی ہیں۔ عربی میں ان کو ابتلاء کہتے ہیں لیکن ہمارے ملک میں ابتلاء برے معنوں میں ہی استعمال ہوتا ہے اس لئے میں ان تکالیف اور ابتلاؤں کو الگ الگ کر دیتا ہوں۔ ایک قسم کی تکالیف انعام کے طور پر آتی ہیں اور ایک قسم کی عذاب کے طور پر۔ چنانچہ دیکھ لو مختلف قوموں کے جتنے بڑے بڑے بزرگ گذرے ہیں ان کی زندگیاں مشکلات میں ہی گذری ہیں۔ ہندو کہتے ہیں اس دنیا کی مشکلات عذاب ہیں۔ ہم کہتے ہیں حضرت کرشنؑ اور رام چندرؑ تو پاک اور نیک انسان تھے ان کو دوسروں کی نسبت کیوں زیادہ تکالیف اٹھانی پڑیں؟ ان کو تو بالکل نہیں ہونی چاہئیں تھیں مگر ماننا پڑے گا کہ دنیا کی تکالیف بزرگوں کو دوسروں کی نسبت زیادہ اٹھانی پڑتی ہیں اور یہ عذاب نہیں ورنہ کہنا پڑے گا کہ نعوذ باللہ وہ سب سے زیادہ

مغضوب تھے۔ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ سب سے زیادہ ابتلاء نبیوں پر آتے ہیں [۹] اور رسول کریم ﷺ اور حضرت مسیح موعودؑ کی زندگیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی درست ہے مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی بات ہے کہ ان کے لئے تکالیف انعام کا باعث تھیں اور مخالفین پر جو تکلیفیں آئیں وہ عذاب تھیں۔

مصائب بطور انعام

اب یہ سوال ہو گا کہ مصائب انعام کس طرح ہو سکتی ہیں؟ اس کے متعلق یاد رکھنا چاہئے کہ مومنوں پر مصائب کے آنے کی چار غرضیں ہوتی ہیں۔

(۱) جب کوئی مصیبت مومن پر آتی ہے تو اس لئے کہ مومن کو اپنے ایمان کا پتہ لگ جائے۔ شاید بہت سے لوگ حیران ہوں گے کہ اپنے ایمان کا پتہ اپنے آپ کو لگنے کا کیا مطلب ہوا؟ اس کو تو ہر انسان جانتا ہے مگر جب میں بتاؤں گا تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ کیسی سچی بات ہے اس کے لئے میں ایک قصہ سناتا ہوں جو پہلے بھی کئی بار سنایا گیا ہے۔ ایک عورت جس کا نام محسنی تھا۔ اس کی لڑکی بیمار تھی۔ ماں اس کے لئے دعا کرتی رہی کہ یہ بچ جائے اور اس کی بیماری مجھے لگ جائے اور میں مرجاؤں۔ ایک دن رات کے وقت گائے کھل گئی اور ایک برتن میں اس نے منہ ڈالا جس میں اس کا سر پھنس گیا۔ وہ برتن کو اٹھائے ہوئے اندر گئی اسے دیکھ کر اس عورت نے سمجھا کہ یہ ملک الموت جان نکالنے کے لئے آیا ہے۔ یہ خیال کر کے وہ کہنے لگی "ملک الموت من نہ محسنی ام من یکے پیرزال محنتی ام"۔ اے ملک الموت میں محسنی نہیں ہوں میں تو ایک بڑھیا مزدوری پیشہ ہوں۔ پھر لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ محسنی وہ لیٹی ہے۔ یعنی میری جان نہ نکال اس کی نکال لے۔ وہ پہلے تو اپنی محبت کے تقاضا سے دعا کرتی رہی کہ اس کی بجائے میں مرجاؤں لیکن جب اس نے سمجھا کہ وقت آگیا۔ تو ہمت ہار گئی اور اسے معلوم ہوا کہ اس کی محبت سچی نہ تھی بلکہ جھوٹی تھی۔

میں اس کے متعلق ایک عام اور موٹی مثال دیتا ہوں۔ لڑائی کی خبریں اخبار میں پڑھتے وقت ہر انسان سمجھتا ہے کہ اگر میں لڑائی میں ہوں تو اس طرح بہادری دکھاؤں اور اس طرح دکھاؤں۔ لیکن خبروں کو سن کر اپنی بہادری کے خیالی پلاؤ پکانے والے لوگوں میں سے ہی بھرتی ہو کر لوگ جنگ میں جاتے ہیں اور وہاں ان کی حالت الٹ ثابت ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ انسان کو بعض اوقات اپنا نفس دھوکا دے رہا ہوتا ہے۔ اور جب وقت آتا ہے تو حقیقت کھل جاتی ہے۔

مشہور ہے۔ کہ ایک شخص جو اپنے آپ کو بڑا بہادر سمجھتا تھا اپنی کلائی پر شیر کی تصویر گدوانے لگا۔ جب گودنے والے نے گودنا شروع کیا۔ اور اسے تکلیف ہوئی تو کہنے لگا۔ کیا گودر ہے ہو؟ اس نے کہا شیر کی دم گود رہا ہوں۔ کہنے لگا اگر دم نہ ہو۔ تو شیر رہتا ہے یا نہیں؟" اس نے کہا ہاں شیر تو رہتا ہے۔ کہنے لگا اچھا اس کو چھوڑ دو اور آگے گودو۔ پھر وہ کان گودنے لگا تو اس نے پوچھا کیا گودتے ہو؟ اس نے بتایا۔ کہنے لگا کان نہ ہوں تو شیر رہتا ہے یا نہیں؟ گودنے والے نے کہا رہتا ہے۔ کہنے لگا اچھا اسے بھی جانے دو اور آگے گودو اس طرح جو عضو گودنے لگتا اس کے متعلق یہی کہہ کر چھڑا دیتا اور آخر بغیر گدوائے اٹھ کر چلا گیا۔ یہی حال عام انسانوں کا ہوتا ہے۔ ایک شخص سمجھتا ہے کہ میں بڑا پکا مومن ہوں۔ اور یہ وہ بناوٹ سے اور جھوٹے طور پر نہیں کہتا بلکہ اس کو یقین ہوتا ہے اور وہ دل سے کہہ رہا ہوتا ہے مگر جب وقت آتا ہے تو اسے پتہ لگتا ہے کہ میرا دعویٰ درست نہ تھا۔ بائبل میں آتا ہے کہ حضرت مسیحؑ نے ایک شخص کے متعلق کہا یہ مجھے دشمنوں کے ہاتھوں میں پکڑائے گا۔ یہ سن کر وہ شخص رو پڑا[۱۰] مگر تھوڑی دیر ہی کے بعد چند روپے لے کر اس نے پکڑوا دیا[۱۱]۔ گویا جب روپے اس کے سامنے آئے تو اسے اس سے محبت کی حقیقت معلوم ہوئی جو وہ حضرت مسیحؑ سے رکھتا تھا۔

پس خدا تعالیٰ ابتلاء کے ذریعہ انسان کو بتاتا ہے کہ تیری کیا حالت ہے اور جب مومن پر مشکل گھڑی آتی ہے اور اسے اپنے اندر کسی قسم کی کمی اور کمزوری معلوم ہوتی ہے تو وہ اس کے دور کرنے کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ جیسے مثلاً چندہ خاص کی تحریک سے جو اس میں حصہ لینے کے متعلق اپنے دل میں قبض محسوس کرے وہ اس کو دور کرنے کی کوشش میں لگ جائے۔

یہ ادنیٰ درجہ تھا جب مومن اس سے اوپر ترقی کرتا ہے تو خدا تعالیٰ اس کو تکالیف میں ڈال کر دوسروں کو دکھانا چاہتا ہے کہ دیکھو میرا یہ بندہ کیسا صابر اور کیسا شکر گزار ہے۔

حضرت ایوبؑ کے متعلق بائبل میں آتا ہے کہ شیطان نے خدا سے کہا کہ تیرے بندے نافرمان ہیں۔ خدا تعالیٰ نے کہا ایسا نہیں ہے۔ شیطان نے کہا جن پر تو انعام کرتا ہے وہ اس انعام کی وجہ سے تیری نافرمانی نہیں کرتے ورنہ دراصل وہ شکر گزار اور فرمانبردار نہیں ہیں۔ خدا تعالیٰ نے کہا دیکھ میرا بندہ ایوب ایسا نہیں ہے۔ شیطان نے کہا مجھے اس کا امتحان لینے کی اجازت دیجئے میں اس سے تمام انعام چھین لوں پھر معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیسا ہے۔ خدا تعالیٰ نے اجازت دے دی اور ان کا سب عیال و اموال مرنے اور تباہ ہونے لگا۔ جانور مال وغیرہ اور اولاد سب تباہ ہو

گئے اور مر گئے مگر وہ خدا تعالیٰ کی حمد ہی کرتے رہے۔ آخر ان کا جسم بھی تکلیف میں مبتلاء ہو گیا مگر پھر بھی ان کی زبان سے ناشکری کا کلمہ نہ نکلا[۱۲]۔ یہ ایوبؑ کا واقعہ اس امر کی مثال کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ کبھی بندہ کو ابتلاء میں اس پر اس کی حقیقت ظاہر کرنے کے لئے نہیں بلکہ دوسرے لوگوں پر اس کی حقیقت ظاہر کرنے کے لئے ڈالتا ہے۔

غرض خدا تعالیٰ دنیا میں لوگوں کو یہ بتانے کے لئے کہ میرے بندے منہ سے ہی شکر گزاری نہیں کرتے بلکہ ہر حالت میں شکر گزار ہوتے ہیں اپنے پاک بندوں پر ابتلاء لاتا ہے۔

تیسری غرض ایسی مشکلات کی مدارج کی ترقی ہوتی ہے۔ ابتلاء اس لئے نازل ہوتا ہے کہ بندہ کو خواہش ہوتی ہے کہ نیکی کا کام اور تو رہا نہیں اب میں کیا کروں؟ خدا تعالیٰ اس پر ابتلاء نازل کر کے اس کے لئے کام نکالتا ہے اور اس وجہ سے اس پر تکلیف آتی ہے۔

چوتھی غرض ان مشکلات کی یہ ہوتی ہے کہ ان کے ذریعہ اس بندہ سے خدا تعالیٰ اپنی محبت اور تعلق کا اظہار کرتا ہے۔ یہ آپ لوگوں کو عجیب بات معلوم ہو گی مگر ہے یہ سچی بات۔ خدا تعالیٰ دشمن کو چھوڑ دیتا ہے کہ میرے فلاں بندے کو دکھ دیتا جا جب وہ بہت بڑھ جاتا ہے تو اس وقت اس کو پکڑ لیتا ہے۔ مثلاً ابو جہل رسول کریم ﷺ کو دکھ دیتا دیتا جب اتنا بڑھ گیا کہ لوگوں نے یہ خیال کرنا شروع کر دیا کہ محمد ﷺ کچھ نہیں کر سکتا تو اس وقت خدا تعالیٰ نے ابو جہل کو پکڑ لیا اور بتا دیا کہ اس طرح خدا کے محبوب کا مقابلہ کرنے والا تباہ ہوا کرتا ہے اور اس طرح جس شان سے ابو جہل پر عذاب آیا اگر مخالفت کے پہلے دن ہی ابو جہل کو مارا جاتا تو یہ شان ظاہر نہ ہوتی۔

ابتلاء اور عذاب میں فرق

اب میں یہ بتاتا ہوں کہ عذاب اور ابتلاء میں کیا فرق ہے۔

(۱) عذاب کا نتیجہ ہلاکت اور تباہی ہوتی ہے مگر ابتلاء کا یہ نتیجہ نہیں ہوتا۔ تکلیفیں تو دونوں طرح ہی آتی ہیں۔ رسول کریم ﷺ کے متعلق ہی دیکھ لو بارہا ایسا ہوا ہے کہ آپ دشمن کے نرغے میں اکیلے پھنس گئے مگر پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو بچا لیا مگر ابو جہل ایک ہی دفعہ فوجوں سمیت ابتلاء میں ڈالا گیا لیکن ہلاک ہو گیا اور زندہ نہ نکل سکا۔

(۲) عذاب کے نتیجہ میں نقصان کی زیادتی ہوتی ہے اور ابتلاء میں نفع کی زیادتی ہوتی ہے۔ ابتلاء کی مثال تو ایسی ہوتی ہے جیسے ربڑ کے گیند کو جتنے زور سے پھینکا جائے وہ اتنا ہی اونچا اٹھتا ہے مگر عذاب میں انسان گر کر اوپر نہیں اٹھ سکتا۔

(۳) عذاب جس انسان پر نازل کیا جاتا ہے اس کے دل میں مایوسی اور گھبراہٹ ہوتی ہے مگر جس پر ابتلاء نازل ہوتا ہے اس کے دل میں اطمینان اور تسلی ہوتی ہے۔ جب عذاب نازل ہوتا ہے تو مغضوب کہتا ہے ہائے میں ہلاک ہو گیا یا اگر وہ اس ابتلاء سے گھبراتا نہیں تو اس کے دل میں کبر اور خود پسندی کے جذبات جوش مارنے لگتے ہیں اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ مجھے کون ہلاک کر سکتا ہے؟ لیکن جب ابتلاء آتا ہے تو انسان کہتا ہے کوئی پرواہ نہیں میں کمزور اور بے کس ہوں لیکن میرے بچانے والا طاقتور ہے اور وہ خدا تعالیٰ پر یقین میں اور بھی ترقی کر جاتا ہے اور خدا تعالیٰ پر اس کی حسن ظنی بہت بڑھ جاتی ہے۔

(۴) عذاب کے دور کرنے کی انسان جب کوشش کرتا ہے تو ٹھوکریں کھاتا جاتا ہے مگر جس پر ابتلاء آتا ہے اس کا فہم رسا ہو جاتا ہے اور وہ بات کو خوب سمجھنے لگ جاتا ہے۔ رسول کریم ﷺ کے متعلق ہی دیکھ لو کفار آپؐ کا کھوج لگاتے لگاتے غار حرا تک پہنچ گئے اور وہاں جا کر کھوجی نے کہہ دیا کہ یا تو وہ آسمان پر چلا گیا ہے اور یا یہیں ہے۔ ان میں کھوجی کی بات کا بڑا لحاظ کیا جاتا تھا اس لئے رسول کریم ﷺ کی جان اس وقت سخت خطرہ میں تھی مگر رسول کریم ﷺ کو ذرہ بھی گھبراہٹ نہ ہوئی۔ آپؐ نے باوجود اس کے کہ آپؐ کی جان کفار کو اصل مطلوب تھی اور ابو بکرؓ کو صرف اس لئے تلاش کرتے تھے کہ وہ آپ کی مدد کرتے تھے۔ آپؐ نے ابو بکرؓ کو تسلی دینی شروع کی اور کہا کہ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا [۱۳] ڈرو نہیں اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ اسی طرح کل ہی میں نے سنایا تھا آپؐ سوئے ہوئے تھے کہ ایک کافر نے آپ کی تلوار اٹھالی اور آپ کو قتل کرنا چاہا لیکن آپؐ ذرہ بھی نہ گھبرائے اور اس کے سوال پر کہ اب آپؐ کو کون بچا سکتا ہے؟ نہایت تسلی سے جواب دیا کہ "اللہ"۔ اس غیر معمولی حالت اطمینان کو دیکھ کر اس کافر پر اس قدر دہشت طاری ہوئی کہ اس کے ہاتھ سے تلوار گر پڑی [۱۴]۔

(۵) پانچواں فرق یہ ہے کہ ابتلاء میں انسان کو احساس بلاء نہیں ہوتا جب ابتلاء آتا ہے تو انسان ان تکالیف کو حقیر سمجھتا ہے اور ان میں لذت محسوس کرتا ہے کیونکہ اس کے دل میں خیال ہوتا ہے کہ میں ادنیٰ چیز کو اعلیٰ پر قربان کر رہا ہوں۔ مثلاً اگر اس کا مال جاتا ہے تو کہتا ہے خدا کے لئے ہی جاتا ہے اس لئے کیا پرواہ ہے۔ یا اگر اس کا بیٹا مر جاتا ہے تو کہتا ہے خدا ہی کے لئے ہے اس کا کیا غم ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہی ایک واقعہ ہے مبارک احمد سے آپؑ کو بڑی محبت تھی اور اس کی بیماری میں آپؑ نے بڑی تیمارداری کی۔ اس سے حضرت خلیفہ اول تک

کو بھی یہ خیال تھا کہ اگر مبارک احمد فوت ہو گیا تو حضرت مسیح موعودؑ کو بڑا صدمہ ہو گا۔ آخری وقت حضرت مولوی صاحب اس کی نبض دیکھ رہے تھے کہ حضرت مسیح موعودؑ کو کہا مشک لائیں اور چونکہ اس کی نبض بند ہو رہی تھی۔ آپ پر اس خیال کا کہ اس کی وفات سے حضرت مسیح موعودؑ کو بہت صدمہ ہو گا اس قدر اثر ہوا کہ آپ کھڑے کھڑے زمین پر گر گئے مگر جب حضرت مسیح موعودؑ کو معلوم ہوا کہ مبارک احمد فوت ہو گیا ہے تو اسی وقت نہایت صبر کے ساتھ دوستوں کو خطوط لکھنے لگ گئے کہ مبارک احمد فوت ہو گیا ہے مگر اس امر پر گھبرانا نہیں چاہئے یہ اللہ تعالیٰ کی ایک مشیت تھی جس پر ہمیں صبر کرنا چاہئے اور پھر باہر آکر مسکرا مسکرا کر تقریر کرنے لگے کہ مبارک احمد کے متعلق خدا تعالیٰ کا جو الہام تھا وہ پورا ہو گیا۔ چنانچہ آپ کا شعر بھی ہے۔

بلانے والا ہے سب سے پیارا
اسی پہ اے دل تو جاں فدا کر

غرض ابتلاء میں دکھ کی حقیقت معلوم ہوتے ہوئے اس کا اثر قلب پر ہمت شکن نہیں ہوتا کیونکہ انسان سمجھتا ہے کہ میں ادنیٰ کو اعلیٰ پر قربان کر رہا ہوں۔ بعض اوقات سخت عذاب میں بھی احساس تکلیف مٹ جاتا ہے مگر یہ اختلال حواس کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ایک دفعہ حضرت خلیفہ اول نے ایک عورت دکھائی اور اس سے پوچھا تمہارے فلاں رشتہ دار کا کیا حال ہے؟ اس نے ہنس کر بتایا وہ تو مر گیا ہے۔ اس طرح ایک دو اور رشتہ داروں کے متعلق پوچھا اور وہ ہنس ہنس کر بتاتی رہی۔ وہ معرفت کے لحاظ سے اس طرح نہیں کرتی تھی بلکہ اس کو بیماری تھی اس میں غم محسوس کرنے کی حس ہی باقی نہ رہی تھی۔

(٦) چھٹا فرق یہ ہے کہ عذاب میں روحانیت کم ہو جاتی ہے مگر ابتلاء میں زیادہ ہو جاتی ہے کیونکہ عذاب میں خدا تعالیٰ سے دوری ہو جاتی ہے مگر ابتلاء میں اور زیادہ توجہ خدا تعالیٰ کی طرف ہو جاتی ہے۔

یہ موٹے موٹے چھ فرق ابتلاء اور عذاب میں ہیں۔ پس یہ سچ ہے کہ دنیاوی تکالیف سے بھی نجات ملتی ہے مگر یہ غلط ہے کہ سب دنیاوی تکالیف عذاب ہوتی ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ کچھ تکالیف عذاب ہوتی ہیں کچھ طبعی نتائج ہوتے ہیں اور کچھ انسان کی روحانیت کی ترقی کے لئے ہوتی ہیں۔

طبعی تکالیف سے نجات

تکالیف دنیاوی کے متعلق یاد رکھنا چاہئے کہ طبعی تکالیف سے نجات نہیں ہو سکتی۔ مثلاً یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی انسان تپ وغیرہ سے بچ جائے ہاں کبھی جب یہ طبعی تکالیف بہت بڑھ جاتی ہیں تو اس وقت اگر انسان خدا تعالیٰ کی طرف جھکے تو خدا ان سے بھی نجات دے دیتا ہے مگر یہ کلی طور پر نہیں ہوتا بعض میں ہو سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے۔ وَاِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ [۱۵] کہ میں پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہوں اور رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ لِكُلِّ دَاءٍ دَوَاءٌ [۱۶] کہ ہر بیماری کی دوا ہے تو یہ تکالیف دعا سے بھی دور ہو جاتی ہیں اور علاج سے بھی۔

کیا ضمیر کے عذاب سے نجات ہو سکتی ہے

اب یہ سوال ہو سکتا ہے کہ کیا ضمیر کے عذاب سے بھی نجات مل سکتی ہے؟ یہ ایک ایسی بات ہے کہ اسلام اور دوسرے مذاہب میں فرق کرنے والی ہے۔ دوسرے مذاہب اس عذاب کو پیدا کرتے ہیں مگر اسلام اس کو دور کرتا ہے۔ مثلاً عیسائیوں میں کفارہ کا مسئلہ ہے اور آریوں میں نیوگ کا مسئلہ۔ ان مسائل کی وجہ سے جو جلن ان کے دلوں میں پیدا ہوتی ہے وہ ان کے مذہب نے پیدا کی ہے اور اسلام ان مسائل کی تردید کر کے اس جلن کو دور کرتا ہے۔ اسلام اس کے لئے ایسا علاج کرتا ہے کہ کہتا ہے دوسروں سے جا کر پوچھ لو کہ میں اپنے ماننے والوں کو کیسا آرام دیتا ہوں رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ۔ [۱۷] بہت دفعہ کافر اپنے دلوں میں حسرت کرتے ہیں کہ کاش وہ ان مسائل کے ماننے والے ہوتے اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان ہو جائیں اس سے انہیں کون روکتا تھا؟ بلکہ یہ مطلب ہے کہ وہ خواہش کرتے تھے کہ کاش یہ عقیدے جو مسلمانوں کے ہیں ہمارے ہوتے۔ وہ دل میں کڑھتے تھے کہ ہمارے مذہب کی ایسی تعلیم کیوں نہ ہوئی جیسی اسلام کی ہے۔ مثلاً آریہ کہتے ہیں کہ نیوگ کی تعلیم اگر ویدوں کی بجائے قرآن میں ہوتی تو ہم مسلمانوں کی کیسی خبر لیتے اور آج جو اعتراض میر قاسم علی صاحب ہم پر کرتے ہیں وہ ہم ان پر کرتے۔

تو قرآن کریم اس ضمیر کے عذاب سے بھی نجات دلاتا ہے۔ پادری فنڈر جو اسلام کا سخت دشمن تھا۔ حضرت مسیح موعودؑ نے اس کا ایک حوالہ دیا ہے اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے دل میں کیسا کڑھتا تھا۔ وہ کرتا تو اسلام پر حملہ ہے مگر لکھتا ہے کہ جہاں عیسائیت نہیں پہنچی وہاں کے لوگوں سے اگر خدا پوچھے گا تو یہی پوچھے گا کہ تم نے اسلامی خدا کو کیوں نہیں مانا؟ کیونکہ عیسائیت کا

خدا ان کی سمجھ سے باہر تھا۔

بد اعمال سے نجات

اب یہ سوال ہے کہ کیا بد اعمال سے بھی نجات ہوتی ہے یا نہیں؟ سوائے اسلام کے سب مذاہب عملاً اس نجات کے منکر ہیں۔ عملاً کا لفظ میں نے اس لئے کہا کہ بعض مذاہب قولاً تو اس امر میں متفق ہیں مگر عملاً نہیں۔ مثلاً مسیحی حضرت مسیحؑ کو پاک کہتے ہیں مگر ان سے پہلے نبیوں کو پاک نہیں کہتے بلکہ ناپاک کہتے ہیں۔ مگر مسیح تو ان کے نزدیک خدا کا بیٹا تھا نہ کہ انسان اس لئے ان کے نقطہ خیال سے کوئی انسان بھی پاک نہ ہوا پس معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک کوئی انسان اس دنیا میں گناہوں سے نجات نہیں پا سکتا۔

مگر اسلام ایک انسان کو پیش کرتا ہے اور ایک کو ہی نہیں ہزاروں لاکھوں کو پیش کرتا ہے اور گناہوں سے نجات کے تین مدارج مقرر کرتا ہے۔ اسلام رسول کریم ﷺ کے متعلق کہتا ہے کہ لوگوں کو کہہ دے فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ [18] رسول کریم ﷺ کا یہ دعویٰ مخالفین کے سامنے پیش کرتا ہے کہ اے محمدؐ! ان کو کہہ دے کہ میں تم میں ہی پیدا ہوا تم میں ہی جوان ہوا اور تم میں ہی بڑھاپے کو پہنچا تم ہی بتلاؤ کیا تم میرا کوئی عیب پکڑ سکتے ہو؟ پھر اگر رسول کریم ﷺ کی یہی حیثیت ہوتی کہ آپؐ نے کوئی گناہ نہ کیا ہوتا مگر آپؐ کی نیکیاں بھی نہ ہوتیں تو وہ کہہ دیتے کہ ہمیں کیا پتہ ہے تم پہلے کیسے تھے ہم تمہارے گناہ تلاش نہیں کرتے رہے مگر رسول کریم ﷺ کا وجود ان کے سامنے نمایاں تھا اور آپؐ کی نیکیوں کے وہ قائل تھے اس لئے کچھ نہ کہہ سکے۔ یہاں سے ایک شخص محمد نصیب پیغامیوں میں چلا گیا ہے اس نے لکھا کہ میں نے اتنی عمر قادیان میں گذاری ہے کیا کسی کو میرے گناہ کا پتہ ہے؟ ہم کہتے ہیں یہاں تمہاری ہستی ہی کیا تھی کہ کسی کو تمہارے عیب کی طرف توجہ ہوتی۔ یوں تو ایک چوہڑا بھی اٹھ کر کہہ سکتا ہے کہ کوئی میرا عیب تو بتاؤ؟ تو اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ بلکہ آپؐ یہ فرماتے ہیں کہ میری ایسی نمایاں زندگی تھی کہ نہ صرف یہ کہ میں گناہوں سے بچا بلکہ میں نے ایسے اعلیٰ کام کئے اور زندگی کا ایسا پاکیزہ نمونہ دکھایا کہ تم خود اعتراف کرتے ہو۔

گناہوں سے پاک ہونے کی دوسری مثال حضرت ابراہیمؑ کی بیان کرتا ہوں۔ قرآن کریم میں آتا ہے مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا [19] خدا کی طرف جھک گیا اور ایسا جھکا کہ بائبل کی رو سے مسیح کا تو شیطان امتحان لینے کے لئے آگیا [20] مگر ان کے

پاس تک نہ پھٹکا۔ پھر ان کے متعلق صِدِّيْقًا نَّبِيًّا [۲۱] آیا ہے۔ اور صدیق اس کو کہتے ہیں جو دل میں بھی ویسا ہی ہو جیسا ظاہر میں۔

یہ تو وہ وجود ہیں جن کے متعلق ثابت ہے کہ گناہ سے پاک ہیں مگر قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایسے وجود بھی گناہ سے پاک ہو سکتے ہیں جو پہلے گنہگار تھے۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ [۲۲] یعنی اے مسلمانو! اگر تم اللہ تعالیٰ کا خوف رکھو اور اس سے مدد مانگو تو وہ تمہارے لئے تمہاری مشکلات میں سے نکلنے کا راستہ بنا دیگا اور تمہاری بدعادتوں کو دور کر دے گا اور پچھلے گناہ بھی بخش دے گا اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

اہل بیت نبوی کے متعلق بھی فرماتا ہے۔ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا۔ [۲۳] اللہ تعالیٰ کا اس کے سوا اور کوئی منشاء نہیں۔ کہ تمہاری تکالیف کو دور کر دے اے اہل بیت! اور تم کو خوب اچھی طرح پاک کر دے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی رو سے اس دنیا میں بھی انسان پاک ہو سکتا ہے۔

میلان گناہ سے نجات

اب یہ سوال ہے کہ کیا میلان گناہ سے بھی نجات ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اسلام میلان گناہ کو بھی دور کر سکتا ہے۔ عیسائیوں کو اس بات کا بڑا دعویٰ ہے کہ اس بات کو ہمارے مذہب نے ہی بیان کیا ہے اور کسی نے بیان نہیں کیا مگر عجیب بات یہ ہے کہ وہ یہ اعتراض تو کرتے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ اس مسئلہ کو جس طرح اسلام نے بیان کیا ہے اس طرح عیسائیت نے بھی بیان نہیں کیا۔

نبی تو الگ رہے خدا تعالیٰ عام مومنوں کے متعلق بھی فرماتا ہے کہ ان کا میلان گناہ بھی مٹا دیا جاتا ہے۔ سورہ محمدؐ میں آتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ [۲۴] کہ اسلام کا خدا وہ خدا ہے کہ وہ لوگ جو ایمان لاتے اور عمل صالح کرتے ہیں خدا ان کی بدیوں کو مٹا دیتا اور ان کے دلوں کو درست کر دیتا ہے۔ ان کے ظاہری عمل ہی درست نہیں ہو جاتے بلکہ ان کے قلوب بھی پاک ہو جاتے ہیں اور گناہ کا میلان تک جاتا رہتا ہے۔ پس رسول کریم ﷺ تو الگ رہے آپؐ کے خدام کی نسبت بھی خدا تعالیٰ کہتا ہے کہ میں ان کے دل صاف کر دیتا ہوں۔

ایک حدیث کا مطلب اس جگہ ایک حدیث کے متعلق یاد رکھنا چاہئے کہ صوفیاء اس کے متعلق بڑے چکر میں پڑے ہیں اور اسے حل نہیں کر سکے۔ حدیث یہ ہے:-

اِذَا سَمِعْتُمْ بِجَبَلٍ زَالَ عَنْ مَكَانِهٖ فَصَدِّقُوْهُ وَاِذَا سَمِعْتُمْ بِرَجُلٍ تَغَيَّرَ عَنْ خُلُقِهٖ فَلَا تُصَدِّقُوْا بِهٖ [۲۵]

یعنی جب یہ سنو کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہل گیا تو یہ ٹھیک ہو سکتا ہے مگر جب یہ سنو کہ کسی نے اپنی طبیعت کو چھوڑ دیا تو یہ غلط ہے۔ اس کے متعلق سوال ہو سکتا ہے کہ جب کوئی انسان طبیعت کو چھوڑ نہیں سکتا تو پھر میلان گناہ بھی نہیں جا سکتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جو آیا ہے کہ طبیعت کے چھوڑنے کو تسلیم نہ کرو اس کے دو معنی ہیں۔ ایک تو فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا سے حل ہو جاتے ہیں یعنی رسول کریم ﷺ نے بتایا کہ کبھی یہ نہیں ماننا چاہئے کہ یک دم کسی کی طبیعت بدل گئی رات کو تو ایک شخص پاکباز سویا مگر صبح کو اٹھ کر خدا پر افتراء کرنے لگ جائے یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ ایسے تغیرات لمبے عرصہ کے بعد ہوا کرتے ہیں۔

دوسرے اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں یہ نہیں بتایا گیا کہ انسان گندے سے نیک نہیں ہو سکتا اور نیک سے گندہ نہیں ہو سکتا بلکہ اس حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ اصول اخلاق بدل نہیں سکتے۔ مثلاً جو شخص نرم طبیعت کا ہو وہ سخت نہیں ہو سکتا اور جو سخت طبیعت کا ہے وہ نرم طبیعت کا نہیں ہو سکتا۔ یا مثلاً جو شخص طبعی طور پر سیاست سے میلان رکھتا ہے وہ عمدہ جرنیل نہیں ہو سکتا اور جو کلی طور پر جنگی معاملات کی طرف میلان رکھتا ہے وہ سیاست کی طرف جھک نہیں سکتا۔ غرض مشق سے 'محنت سے' عادت سے خواہ کسی قدر ہی کوئی دوسرے پیشہ کی طرف توجہ کرے وہ ایسا اعلیٰ اس فن میں نہیں ہو سکتا جس قدر کہ وہ اس فن میں ہو سکتا ہے جس سے وہ طبعی میلان رکھتا ہے۔ اور اس میں یہ سیاسی سبق دیا ہے کہ جب حکومت مسلمانوں کو ملے تو ان کو چاہئے افسر مقرر کرتے وقت ان کی طبائع کو دیکھ لیا کریں کہ ان کا میلان کس طرف ہے۔ ورنہ یہ مراد نہیں کہ نیک بد اور بد نیک نہیں ہو سکتا کیونکہ اول تو یہ تعلیم قرآن کے خلاف ہے پھر مشاہدہ کے خلاف ہے۔ اور یہ بات بھی ہے کہ نیکی بدی خلق نہیں ہے نیکی بدی تو طبعی اخلاق کے صحیح یا بد استعمال کا نام ہے اور اس حدیث میں ان طبعی قوتوں کے بدلنے کو مشکل قرار دیا ہے جو انسان کی پیدائش کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں نہ کہ ان کے صحیح یا غلط استعمال کو۔

غرض اس حدیث میں یہ نہیں بتایا گیا کہ نیک بد اور بد نیک نہیں ہو سکتا بلکہ یہ کہ جو خُلق کفر میں نمایاں ہوں گے وہی اسلام میں بھی نمایاں ہوں گے۔ مثلاً جو کفر میں سختی کرتا تھا وہ اسلام میں بھی اس صفت کو زیادہ استعمال کرے گا گو نیک طور پر۔ یا جو کفر میں نرم طبیعت رکھتا تھا وہ اسلام میں بھی اسی طبیعت کا رہے گا گو وہ نرمی کو نیک طریق پر استعمال کرنے لگے گا۔

مثال کے طور پر حضرت عمرؓ اور حضرت ابو بکرؓ کو لے لو۔ حضرت عمرؓ حالت کفر میں سخت طبیعت تھے اور حضرت ابو بکرؓ اسلام سے پہلے بھی نرم طبیعت کے تھے۔ اسلام نے ان دونوں کو نیک تو بنا دیا اور تقوای کی اعلیٰ راہوں پر تو چلا دیا لیکن ان کی طبیعتوں کو نہیں بدلا۔ حضرت عمرؓ اسلام میں بھی اپنی اسی طبیعت پر قائم رہے جس پر کفر میں تھے اور اسی طرح حضرت ابو بکرؓ لیکن فرق یہ تھا کہ اسلام سے پہلے ان کی سختی اور نرمی غلط طور پر استعمال ہوتی تھیں یا ہو سکتی تھیں مگر اسلام میں آکر وہ اعلیٰ مقاصد میں استعمال ہونے لگیں۔ عمرؓ سخت کے سخت ہی رہے اور ابو بکرؓ نرم کے نرم۔ لیکن دونوں ہی اپنی حالت کو چھوڑ کر نیکی کا مجسمہ بن گئے پس اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ طبیعت نہیں بدل سکتی یا یہ کہ مشکل سے بدل سکتی ہے اس لئے جہاں تک ہو سکے طبیعت کے مطابق کسی کو کام سپرد کرنا چاہئے۔

گناہ کے طبعی نتیجہ سے نجات

نجات کے متعلق ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا گناہ کے طبعی نتیجہ سے نجات ہو سکتی ہے؟ قرآن کریم کہتا ہے کہ ہو سکتی ہے۔ چنانچہ آتا ہے اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمۡ اَنَّ عَلَيۡهِمۡ لَعۡنَةَ اللّٰهِ وَالۡمَلٰٓـئِکَةِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِيۡنَ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنۡهُمُ الۡعَذَابُ وَلَا هُمۡ يُنۡظَرُوۡنَ۔ اِلَّا الَّذِيۡنَ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ وَاَصۡلَحُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ۔[۲۶]

بعض انسان گناہ میں ترقی کرتے کرتے یہاں تک پہنچ جاتے ہیں کہ ان پر خدا اور ملائکہ اور تمام لوگوں کی لعنت پڑنے لگتی ہے۔ وہ اس کے اندر ہمیشہ رہتے ہیں اور ان سے عذاب کم نہیں کیا جاتا اور نہ ان کو مہلت ملتی ہے مگر توبہ سے یہ بات بدل جاتی ہے اور انسان گناہ کی طبعی سزا سے بچ جاتا ہے یعنی لعنت یا خدا سے دوری سے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ اس آیت میں گناہ کی طبعی سزا کا ذکر ہے جو خدا تعالیٰ سے دور ہو جانا یا گناہوں میں بڑھ جانا ہے نہ کہ شرعی سزا کا جو دوزخ یا دوسری تکالیف ہیں۔

گناہ کے شرعی اثر سے نجات

اب یہ سوال ہے کہ کیا گناہ کے شرعی اثر سے بھی نجات ہو سکتی ہے؟ قرآن کریم کہتا ہے ہاں ہو سکتی ہے۔ چنانچہ سورۃ زمر میں آتا ہے۔ قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ۔ [۲۷] خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اے میرے بندو! گھبراتے کیوں ہو کہ اب گناہگار ہو گئے ہیں۔ اگر تم نے کوئی گناہ بھی نہیں چھوڑا سب کر لئے ہیں تو بھی میں سب گناہ معاف کر سکتا ہوں کیونکہ میں گناہ معاف کرنے والا ہوں۔

حقیقی نجات

اب یہ سوال ہے کہ کیا حقیقی نجات انسان کو مل سکتی ہے؟ دیگر مذاہب کے لوگ کہتے تو ہیں کہ ہمارے مذہب میں بھی ایسی نجات ہے مگر کوئی پیش تو کرے۔ قرآن کریم میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ [۲۸] اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو۔ تو محمد (ﷺ) سے محبت کرو تم خدا کے محبوب ہو جاؤ گے۔ اور خدا کا پیارا ہو جانا اور اس کا مقرب ہو جانا ہی حقیقی نجات ہے۔

اس آیت سے بھی بڑھ کر حقیقی نجات کے ملنے کے متعلق مندرجہ ذیل آیت میں زور دیا گیا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ۔ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ [۲۹] یعنی وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے اور ورلی دنیا پر ہی راضی ہو گئے ہیں اور اس پر ان کو اطمینان حاصل ہو گیا ہے اور وہ لوگ جو ہمارے نشانوں سے غافل ہو گئے ہیں وہ لوگ ایسے ہیں کہ ان کا ٹھکانا ان کے اعمال کے سبب سے جہنم ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی نجات یعنی لقاء الٰہی کے منکر کو سخت سزا سے ڈرایا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلام نجات کے لئے کس قدر زور دیتا ہے۔

نجات روحانی ہے یا جسمانی؟

ایک سوال یہ ہے کہ نجات روحانی ہے یا جسمانی؟ یہ بھی مختلف مذاہب میں بحث طلب امر ہے مگر یہ بحث ایک خطرناک دھوکا سے پیدا ہوئی ہے۔ دھوکا یہ لگا ہے کہ لوگ خیال کر لیتے ہیں کہ جسم اس چیز کا نام ہے جو مرئی ہو اور جو چیز نظر نہ آئے وہ روح ہے جس سے جسم میں حرکت پیدا ہوتی ہے مگر یہ تعریف بالکل غلط اور ناقص ہے۔ اصل میں جسم کا لفظ ایک نسبتی حقیقت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور اس کی تعریف یہ ہے کہ جسم وہ شئے ہے جس میں اس سے الطف چیز رہتی ہے اور جس کے بغیر وہ لطیف شئے رہ نہیں سکتی۔ گویا جسم وہ برتن ہے جس میں ایک الطف چیز بطور اتحاد کے رہتی

ہے اور وہ الطف چیز روح ہے۔ پس کوئی مخلوق روح جسم کے بغیر نہیں رہ سکتی اور یہ بحث ہی غلط ہے کہ نجات یا عذاب جسم کو ہو گا یا روح کو؟ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس پتلے کے ساتھ عذاب یا نجات ہو گی وہ بہت ہی بے وقوفی کی بات کہتے ہیں کیونکہ یہ تو بدلتا رہتا ہے۔ پھر کس عمر کے جسم کے ساتھ نجات یا عذاب ہو گا اس جسم کے ساتھ جو بیس برس کی عمر میں تھا یا جو تیس برس کی عمر میں تھا۔

اور دوسرے لوگ جو کہتے ہیں کہ چونکہ یہ جسم نہیں ہو گا اس لئے نجات یا عذاب بھی جسمانی نہیں بلکہ صرف روحانی ہوں گے وہ بھی سخت غلطی کرتے ہیں اور ان کا قول بھی خلاف عقل ہے۔ کیا اگر یہ کہا جائے کہ فلاں شخص نے کالا کوٹ نہیں پہنا ہوا تو اس کا یہ مطلب ہو گا کہ وہ ننگا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اغلب ہے کہ اس نے کوئی اور کپڑا پہنا ہوا اسی طرح اگر یہ جسم نہیں ہو گا تو کیا ہوا کوئی اور جسم ہو گا۔

قرآن کریم میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ کوئی روح جسم کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ آتا ہے وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ [۳۰] کہ ہم نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا کر کے پیدا کیا ہے تاکہ تم اس قانون کو دیکھ کر نصیحت حاصل کرو۔ یعنی یہ قانون ایک اور بالا امر کی طرف دلالت کرتا ہے اور وہ وحدت باری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے ثبوت اور اپنی وحدت کی حفاظت اور اس کی حقیقت کو اشتباہ سے بچانے کے لئے یہ قانون بنا دیا ہے کہ کوئی چیز مخلوق میں سے ایسی نہیں جو مفرد ہو کر زندہ رہ سکے بلکہ ہر چیز اپنے قیام کے لئے کسی اور چیز کی حاجت مند ہے جو اس کے لئے بمنزلہ جسم کے ہے اور یہ قانون مخلوق سے کسی حالت میں بھی الگ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کو کسی شرط سے محدود نہیں کیا گیا۔ پس اگلے جہان میں بھی ہر انسان کا ایک جسم ہو گا ایک روح ہو گی اور عذاب اور انعامات جسمانی و روحانی دونوں طرح کے ہوں گے۔ ہاں مگر قرآن اور حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگلے جہان میں یہ جسم نہ ہو گا کیونکہ اس جسم کے متعلق آتا ہے کہ یہ نعمائے جنت کو محسوس ہی نہیں کر سکتا جن میں سے سب سے بڑی نعمت رؤیت الٰہی ہے۔ پس وہاں یہ جسم نہیں جائے گا بلکہ کوئی اور ہو گا۔

اس بات کے مؤید بعض نئے علوم بھی ہیں۔ سپر چولزم (SPIRITUALISM) کے تجارب سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ روح ہمیشہ ایک جسم میں رہتی ہے۔ میں اس سپر چولزم کا قائل نہیں کہ اس کے ذریعہ مردوں کی روحیں بلوائی جاتی ہیں مگر میں اس کا قائل ہوں کہ روحیں چلتی

پھرتی نظر آجاتی ہیں۔ اگلے جہان کے جسم کے متعلق معلوم یہ ہوتا ہے کہ قبر میں روح انسانی ترقی کرتے کرتے ایسا نشوونما پیدا کرے گی کہ اس میں سے ایک اعلیٰ جوہر پیدا ہو جائے گا جو اس روح کے لئے بمنزلہ روح کے ہوگا اور موجودہ روح اس کے لئے بمنزلہ جسم کے ہو جائے گی۔ یہ نئے روح اور جسم جنت اور دوزخ کی نعمتوں یا عذابوں کو محسوس کرنے کے قابل ہوں گے۔

چونکہ قبر کی نسبت وہی لفظ آئے ہیں جو رحم کے لئے آتے ہیں اس لئے وہ روح کے لئے رحم کے طور پر ہے جس میں روح ترقی کرتی ہے اور اس کو نیا جسم حاصل ہوتا ہے۔

اب یہ سوال ہو سکتا ہے کہ جب یہ روح اور جسم ہی بدل جائے گا تو پھر عذاب و ثواب کیسا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کے بدلنے سے مراد شکل کا بدلنا ہے ورنہ ان میں مشارکت چلی جاتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو نطفہ میں وہ کیڑا جس سے بچہ بنتا ہے اس قدر چھوٹا ہوتا ہے کہ خوردبین سے ہی نظر آتا ہے لیکن اگر باپ میں سل ہو تو بسا اوقات بچے کو بھی ہو جاتی ہے کیونکہ سل کا اثر اس نطفہ کے کیڑے کے ذریعہ بچہ میں بھی منتقل ہو جاتا ہے اسی طرح روح اور جسم جو نئی شکل اختیار کرتے ہیں وہ اپنے حالات کو اس نئی شکل کی طرف منتقل کرتے چلے جاتے ہیں۔

کہتے ہیں سات سال میں انسان کا پہلا جسم بدل جاتا ہے مگر باوجود اس کے بدصورت بدصورت ہی رہتے ہیں اور حسین حسین ہی۔ یہ نہیں ہوتا کہ بدصورت سات سال کے بعد حسین ہو جائے۔ اور حسین بدصورت بن جائے۔ وجہ یہ ہے کہ جسم بدلنے کے لئے جو نیا ذرہ آتا ہے وہ اسی طرح اس جسم میں رکھا جاتا ہے جس طرح پہلا ذرہ ہوتا ہے اسی لئے اگر جسم پر کسی جگہ زخم وغیرہ کا کوئی نشان ہو تو وہ اسی طرح رہتا ہے۔ اسی طرح روح بھی احساسات کا مادہ منتقل کرتی چلی جائے گی۔ اور ہر تغیر پہلے کے احساسات کو لیتا جائے گا اس لئے خواہ روح کی کچھ بھی شکل بدل جائے وہ پہلے عذابوں یا انعاموں کا مستحق ہوگا۔ اور اگر ہم یہ مان لیں کہ متغیر شدہ شکل کو پہلی سے کوئی مشارکت نہیں رہتی تو پھر زندگی کیا رہی۔ پھر تو ماننا پڑے گا کہ پہلی چیز مر گئی اور کوئی نئی چیز پیدا ہوئی ہے۔

نجات دائمی ہے یا عارضی

ایک یہ سوال ہے کہ نجات دائمی ہے یا عارضی؟ ہندوؤں کا اس کے متعلق عجیب عقیدہ ہے۔ وہ کہتے ہیں نجات دائمی نہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں جب روحیں نجات پا جاتی ہیں تو وہ خدا میں مل جاتی ہیں اور اس کے پیٹ میں چلی جاتی ہیں۔ خدا ایک لمبے عرصہ تک سوتا رہتا ہے پھر جب اٹھتا ہے تو اسے قے آتی ہے اور روحیں

اس کے پیٹ سے نکل آتی ہیں اور پھر دنیا کے چکروں میں چل پڑتی ہیں اور اس طرح دنیا چلتی رہتی ہے۔

اب دیکھو تعلیم یافتہ ہندو اس عقیدہ کو دیکھ کر یہی کہتے ہوں گے کہ رُبَمَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْ کَانُوْا مُسْلِمِیْنَ۔ مسلمانوں کا کیا اچھا عقیدہ ہے۔ ہمارے باپ دادا کیسے تھے انہوں نے کیوں نہ یہی عقیدہ لے لیا۔ گویا ان کے نزدیک نجات یہی ہے کہ خدا کے پیٹ میں روحیں پڑی رہیں اور جب ہضم نہ ہوں تو قے کے ذریعہ نکل آئیں۔

آریہ لوگ اس رنگ میں نجات نہیں مانتے کیونکہ وہ خدا میں جذب ہو جانے کے عقیدہ کے قائل نہیں لیکن وہ بھی اس امر کے قائل ہیں کہ ایک عرصہ تک نجات پا جانے کے بعد روحیں پھر جنت میں سے نکال دی جائیں گی اور اللہ تعالیٰ ان کے ایک گناہ کے بدلہ میں جو بغیر بدلے کے رکھ چھوڑے گا ان کو پھر جونوں کے چکروں میں ڈال دے گا۔

ہندو مذہب کے علاوہ دوسرے مذاہب کے نزدیک نجات دائمی ہے جیسے مسیحی' یہودی' زرتشتی وغیرہ۔

قرآن کریم میں اس عقیدہ کو بہت واضح کیا گیا ہے۔ فرماتا ہے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ [۳۱] کہ وہ لوگ جو مومن ہیں۔ نیک عمل کرنے والے ہیں۔ ان کو نہ گننے والا انعام ملے گا۔ یعنی ہمیشہ کا۔ پس اسلامی نقطہ نگاہ سے نجات ہمیشہ کے لئے ہوگی۔

محدود اعمال کا غیر محدود بدلہ

اس عقیدہ پر ایک اعتراض کیا جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ محدود اعمال کا غیر محدود انعام کس طرح مل سکتا ہے؟

اس کے متعلق اول تو ہم یہ کہتے ہیں کہ تم کہتے ہو اعمال اور انعام میں مناسبت ہونی چاہئے مگر یہ بات تو تمہارے عقیدہ سے بھی غلط ثابت ہو جاتی ہے کیونکہ تم مانتے ہو کہ اربہا سال تک روح کو نجات ملے گی اور پھر اس کو جونوں میں ڈالا جائے گا مگر عمل تو اس کے چند سال کے ہوں گے اتنا عرصہ اسے نجات کیوں دے دی گئی؟ اعمال کے لحاظ سے نجات بھی تھوڑا عرصہ ہی چاہئے تھی اور اگر چند سال کے عمل کے بدلہ میں اربوں سال نجات مل سکتی ہے تو غیر محدود نجات کیوں نہیں مل سکتی؟ اور اس پر کیوں اعتراض ہو سکتا ہے۔ کیا صرف محدود اور غیر محدود کے الفاظ کی وجہ سے؟

دوسرے یہ کہ جب روح خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری کے لئے کھڑی ہے اور وہ کہتی ہے کہ اگر مجھے خدا تعالیٰ اس جسم میں ہمیشہ رکھے گا تو ہمیشہ فرمانبردار رہوں گی تو پھر اگر اس کو موت دے دی

گئی تو اس کا اس میں کیا قصور ہے اس کو تو ابدی نجات ملنی چاہئے۔

تیسرے یہ کہ نجات ذاتی پاکیزگی کا نام ہے اور جب پاکیزگی حاصل ہو گئی تو پھر اس سے گرانا سخت بے انصافی ہے جب تک ذات میں برا تغیر نہ ہو عذاب میں نہیں ڈالا جا سکتا اور وہاں برا تغیر ہو نہیں سکتا کیونکہ اعمال ختم ہو گئے پس یہ غلط ہے کہ نجات محدود ہو گی۔

کیا نجات سب کا حق ہے یا بعض کا؟

اب یہ سوال ہے کہ کیا نجات سب انسانوں کا حق ہے یا بعض کا؟ یہودیوں کے نزدیک خاص کا ہی حق ہے۔ وہ کہتے ہیں صرف یہودی نجات پائیں گے۔ ہندوؤں کے نزدیک ہر ایک انسان نجات پا سکتا ہے مگر وہی جو اپنے اعمال کے زور سے پائے۔ ان کے نزدیک فضل کوئی چیز نہیں ہے گویا وہ یہ مانتے ہیں کہ ہر شخص نجات پا سکتا ہے مگر یہ نہیں کہتے کہ ہر ایک پاتا بھی ہے۔

مسیحیوں کے نزدیک ہر شخص نجات پا سکتا ہے مگر جس نے اس دنیا میں نہ پائی وہ پھر نہیں پا سکتا۔ پارسیوں اور مسلمانوں کا خیال آپس میں ملتا ہے۔ پارسی کہتے ہیں ہر شخص نجات پائے گا صرف آگے پیچھے کا فرق ہو گا۔ بعض لوگ عذاب کو پا کر نجات پائیں گے اور بعض پہلے ہی یہی اسلام کا عقیدہ ہے۔ قرآن کریم نے اس کا ذکر مندرجہ ذیل آیات میں کیا ہے۔

پہلی آیت جو اصل اصول ہے اس میں بندہ کی پیدائش کی غرض یہ بیان کرتا ہے کہ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ۔ [۳۲] انسان اور جن کو پیدا ہی عبادت کے لئے کیا گیا ہے۔ پس جب انسان پیدا ہی اس غرض کے لئے کیا گیا ہے تو ضروری ہے کہ ہر بندہ اس غرض کو پورا کرنے والوں میں شامل ہو جائے اور یہی نجات ہے۔

دوسری جگہ یوں تشریح کی ہے کہ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ [۳۳] میرے بندوں میں داخل ہو جاؤ اور میری جنت میں داخل ہو جاؤ۔

اس سے معلوم ہوا کہ بندہ بننے کا لازمی نتیجہ ہے کہ انسان جنت میں داخل ہو جائے۔ پس جب کہ ہر ایک شخص کو اللہ تعالیٰ نے بندہ بننے کے لئے پیدا کیا ہے اور جس مقصد کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا ہے ضرور ہے کہ کسی نہ کسی وقت اس کو وہ پورا کرنے والا ہو جائے اور جب بھی وہ اس کو پورا کرے گا ضرور ہے کہ دوسرے قاعدے کے مطابق اپنے آقا کی جنت میں داخل ہو جائے اور یہی نجات ہے۔

پھر فرماتا ہے۔ وَنَضَعُ الْمَوَازِیْنَ الْقِسْطَ لِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَیْئًا وَاِنْ كَانَ

مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حَاسِبِيْنَ [۳۴] اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اگر کسی نے ذرہ بدی یا نیکی کی ہوگی تو اس کا محاسبہ کیا جائے گا اب بدی کی وجہ سے جب انسان جہنم میں چلا گیا اور ابد الاباد تک اسی میں رہا تو نیکیوں کا بدلہ کب پائے گا؟ اس لئے ضروری ہے کہ وہ نجات پائے۔

یہاں آریوں سے اسلام کا عجیب مقابلہ پڑتا ہے انہوں نے عجیب عقیدہ بنایا ہے کہ وہ کہتے ہیں پرمیشور ہر ایک روح کا ایک گناہ رکھ چھوڑتا ہے اور نجات پہلے دے لیتا ہے پھر اس گناہ کی وجہ سے سزا دیتا ہے۔ گویا اسلام تو یہ کہتا ہے کہ خدا گناہوں کی سزا پہلے دیتا ہے اور پھر نجات دیتا ہے مگر آریہ کہتے ہیں انعام پہلے دیتا ہے اور عذاب پیچھے تا کہ روح ابدی نجات نہ پا جائے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ اعلیٰ مذہب کونسا ہے اور کس کا عقیدہ اعلیٰ درجہ کا ہے۔ ہر ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ گناہ کو چھپا رکھنا یہ سخت کینہ توزی کی علامت ہے اور ایسی ہی عادت ہے جیسے کہ بنئے روپیہ قرض دیکر بہت سا روپیہ تو وصول کر لیتے ہیں اور کچھ تھوڑا سا باقی رکھتے ہیں پھر اس کو چند سالوں کے بعد سود سمیت بہت بڑھا کر وصول کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف ایسی بات منسوب کرنی سخت ظلم ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں اسلام کی تعلیم کہ جس شخص کو ضرور ہی سزا دینی ہو اس کو پہلے اس کے برے عملوں کی سزا دی جائے اس کے بعد اس کی نیکیوں کا بدلہ دینا شروع کیا جائے تا کہ وہ ابدی نجات پا جائے۔ کیسی رحم کی تعلیم اور کس قدر خوبصورت عقیدہ ہے!

مذکورہ بالا آیات کے علاوہ اور آیات بھی نجات کے عام ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ دوزخ کے متعلق فرماتا ہے۔ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ [۳۵] کہ جن کو سزا دی جائے گی ان کی ماں ہاویہ ہوگی وہ اس کے پیٹ میں ڈالے جائیں گے۔ ماں کے پیٹ میں بچہ کیوں رکھا جاتا ہے؟ اس لئے کہ اس دنیا میں زندہ رہنے کی طاقت آجائے اور اس کی کمزوری دور ہو جائے اسی طرح جہنم رکھا گیا ہے تا کہ وہاں انسان کی کمزوری دور ہو۔ جہنم کو خدا تعالیٰ نے ظلمت قرار دیا ہے اور رحم کو بھی ظلمت کہا گیا ہے اور جس کی آنکھیں خراب ہوں اس کے لئے ضروری ہے کہ اسے اندھیرے میں رکھا جائے تا کہ اس کی آنکھوں میں نور کو دیکھنے کی طاقت آجائے۔

پھر فرماتا ہے فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ○ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ○ وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ عَطَآءً غَيْرَ

مَّجْذُوْذٍ۔ [۳۶] جو شقی ہو گئے وہ آگ میں ڈالے جائیں گے جس میں سے شدت کی وجہ سے آوازیں نکلیں گی۔ وہ اس میں اس وقت تک رہیں گے جب تک آسمان و زمین رہیں گے سوائے اس کے کہ تیرا رب کچھ اور ارادہ کرے۔ تیرا رب اپنے ارادہ کو پورا کرنے والا ہے۔ اور وہ لوگ جو سعید ہوں گے وہ جنت میں رہیں گے جب تک کہ آسمان اور زمین رہیں سوائے اس کے کہ تیرا رب کچھ اور چاہے مگر یہ نعمت ان کی کاٹی نہیں جائے گی اور کبھی اس سے ان کو محروم نہیں کیا جائے گا۔

یہاں سعید اور شقی انسانوں کی حالت کا مقابلہ کیا ہے۔ جہنمیوں کے متعلق تو فرماتا ہے کہ ہم ان کو جہنم سے نکال سکتے ہیں اور ہمارے ارادہ کو کون روک سکتا ہے لیکن مومنوں کے لئے فرماتا ہے کہ اگر چاہیں تو ان کو بھی نکال سکتے ہیں مگر ہم نے یہی چاہا ہے کہ ان کے انعام کو کبھی ختم نہ کریں۔ اس مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دوزخیوں کو جہنم سے نکلنے کی امید دلائی گئی ہے لیکن جنتیوں کو اس انعام کے کبھی نہ ہٹانے کے وعدہ سے مطمئن کیا گیا ہے۔

پھر فرماتا ہے قَالَ عَذَابِىْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ وَ رَحْمَتِىْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ [۳۷] میں عذاب پہنچاؤں گا اس کو جس کو عذاب کے لائق سمجھوں گا اور میری رحمت وسیع ہے کل چیزوں پر عذاب بھی اس کے حلقہ میں ہے۔ اور میں فرض کر دوں گا رحمت کو ان پر جو متقی ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور میری آیات پر ایمان لاتے ہیں۔

میں اس آیت کی بجائے خود تشریح کرنے کے ابن عربی کا ایک لطیفہ اس آیت کے متعلق بیان کرتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں سہیل ایک بزرگ گزرے ہیں ان کا شیطان سے مقابلہ ہوا۔ سہیل نے کہا کہ تو کبھی نہیں بخشا جائے گا۔ شیطان نے اپنی تائید میں مندرجہ بالا آیت پڑھی اور نتیجہ نکالا کہ آخر میں بھی بخشا جاؤں گا۔ انہوں نے کہا یہاں قید بھی تو لگی ہوئی ہے کہ میں اپنی رحمت کو مومن اور متقی بندوں کے ساتھ مخصوص کروں گا۔ شیطان نے کہا خدا تعالیٰ کے لئے قید نہیں ہوتی قید تو بندوں کے لئے ہوتی ہے۔ اس پر سہیل کہتے ہیں میں شرمندہ ہو گیا اور میں نے سمجھا کہ یہ جیت گیا۔

یہ تو خیر ایک لطیفہ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جو امور اس جگہ بیان کئے گئے ہیں بطور شرط کے نہیں ہیں بلکہ اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جنت میں جانے والے لوگ دو قسم کے ہوں گے۔

ایک بطور حق کے اس میں داخل ہوں گے یہ تو وہ لوگ ہیں کہ جو ہر طرح دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رضاء کو حاصل کرتے رہے اور ایک وہ لوگ جو بطور رحم اور بخشش کے جنت میں داخل کئے جائیں گے اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ کی آیت میں۔ حق سے مراد یہ نہیں کہ حقیقی طور پر مومن کا حق ہو گا بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مومن کا یہ حق مقرر کر دیا ہے دوسرے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ پہلے یہ فرماتا ہے کہ میں جس کو چاہوں گا عذاب دوں گا۔ اور پھر فرماتا ہے میری رحمت وسیع ہے اور پھر کافروں کو کہتا ہے کہ دیکھو جب میں ہر ایک کو اپنی رحمت دینے کے لئے تیار ہوں تو کیا محمد (ﷺ) کو ہلاک ہونے دوں گا؟ جب ہلاک ہونے والوں کو بچانے کے لئے تیار ہوں تو اس کو کیوں ہلاک ہونے دوں گا؟

اسی طرح حدیث میں آتا ہے یَاْتِیْ عَلٰی جَہَنَّمَ زَمَانٌ لَیْسَ فِیْھَا اَحَدٌ وَنَسِیْمُ الصَّبَاءِ تُحَرِّکُ اَبْوَابَھَا [۳۸] ترجمہ: ایک زمانہ جہنم پر ایسا آئے گا کہ ہوا اس کے دروازے کھٹکھٹائے گی گویا سب لوگ جہنم سے نکل چکے ہوں گے اور اس لئے اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور عذاب کی جگہ اس کے مقام پر بھی رحمت کی ہوائیں چل پڑیں گی۔ اور وہ مقام عذاب کا نہیں رہے گا۔

اسی طرح حدیث شفاعت میں آتا ہے کہ خدا تعالیٰ شفاعت سے کچھ لوگوں کو نکالے گا۔ آخر خدا اپنی مٹھی ڈالے گا اور جس قدر اس کی مٹھی میں لوگ آئیں گے سب کو نکال لے گا [۳۹] اور یہ بات ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کی مٹھی سے کوئی چیز باہر نہیں رہ سکتی۔

پھر عقلی دلیل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی صفات دو قسم کی ہیں۔ ایک غضب والی۔ دوسری رحمت والی۔ صفات غضبیہ صرف بندے کے فعل کے جواب میں ظاہر ہوتی ہیں اور صفات رحمت بندے کے فعل کے بغیر بھی ظاہر ہوتی ہیں۔ جیسے خدا تعالیٰ نے انسان کو ناک، کان، منہ دیا ہے یہ کسی فعل کے نتیجہ میں نہیں دیا بلکہ اپنی رحمت سے دیا ہے۔ پس رحمت کی صفت وسیع ہے اور جب کہ یہ صفت اپنے عرض میں اس قدر وسیع ہے ضروری ہے کہ اپنے طول میں بھی وسیع ہو۔ یعنی ایک زمانہ آئے کہ یہ صفات غضبیہ سے آگے نکل جائے اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ آخر سب لوگ معاف کر دیئے جائیں۔

کافر کی نجات

اس مسئلہ پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہر چیز اپنی حقیقت میں ترقی کرتی چلی جاتی ہے- پس جو شخص یہاں سے کافر مرا ضروری ہے کہ وہ مرنے کے بعد کفر میں ترقی کرے اور چونکہ وہ کفر میں ترقی کرے گا اس لئے اس کی نجات نہیں ہو سکے گی-

اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک بلا علاج کے مرض ترقی کرتی ہے مگر علاج سے رک جاتی ہے اور جہنم علاج ہی ہے اس لئے مرنے کے بعد وہ مرض جس میں کوئی انسان دنیا میں مبتلاء ہے بڑھتا نہیں بلکہ دور ہوتا ہے اور اس طرح نجات پا جاتا ہے-

اس پر عیسائی دو اعتراض کرتے ہیں- ایک تو یہ کہ ہم کہتے ہیں دوزخ علاج نہیں ہے کیونکہ مرنے کے بعد ہر ایک انسان کو خدا کی قدرت' اس کا جلال اور حقیقت معلوم ہو جائے گی- پس اگر جہنم علاج ہوتی تو اس انکشاف کے بعد انسان کو دوزخ میں نہیں ڈالنا چاہئے کیونکہ اس کو عرفان حاصل ہو گیا لیکن چونکہ باوجود اس عرفان کے انسان دوزخ میں ڈالا جاتا ہے اس لئے معلوم ہوا کہ اس میں بطور علاج نہیں بلکہ بطور سزا ڈالا جائے گا-

اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارا یہ مذہب نہیں اور نہ یہ درست ہے کہ قیامت کو کفار کو عرفان حاصل ہو جائے گا- عرفان نہیں بلکہ ان کو یقین حاصل ہو گا اور یقین اور شئے ہے اور عرفان اور شئے ہے- صرف یقین سے کوئی چیز بچ نہیں سکتی بلکہ عرفان سے بچتی ہے- یہ بات کہ یقین اور عرفان میں فرق ہے میں اپنے پاس سے نہیں کہتا بلکہ قرآن کریم سے ثابت ہے- چنانچہ ایک طرف تو قرآن کریم کی بہت سی آیات سے یہ امر ثابت ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی طاقتوں پر کفار کو یقین ہو جائے گا اور وہ سمجھ لیں گے کہ اب ہم بچ نہیں سکتے- دوسری طرف اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى [40] یعنی جو اس دنیا میں خدا تعالیٰ کا عرفان نہیں رکھتا اور اس کو اپنے دل کی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا آخرت میں بھی نہیں دیکھ سکے گا- اسی طرح فرماتا ہے- كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ [41] یعنی کفار قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی رویت حاصل نہیں کریں گے- ان دونوں باتوں کے ملانے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک یقین اور عرفان میں فرق ہے وہ اس امر کا تو مدعی ہے کہ کفار کو خدا تعالیٰ کی قدرتوں پر یقین آجائے گا اور اپنی غلطیوں کا علم ہو جائے گا مگر وہ اس امر کا انکار کرتا ہے کہ ان کو اس کا عرفان حاصل ہو جائے گا بلکہ فرماتا ہے کہ باوجود اس یقین کے وہ اگر دنیا میں اندھے تھے تو آخرت میں بھی اندھے کے اندھے ہی رہیں گے-

اگر کوئی شخص ادنیٰ تدبر سے کام لے تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ قرآن کی یہ تفریق درست ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی رؤیت اور اس کا لقاء محض یقین سے نہیں ہوتا بلکہ بعض خاص روحانی طاقتوں کے حصول سے ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ پر کامل یقین رکھنے والے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں لوگ موجود ہیں لیکن ان کو وہ برکات نہیں ملتیں جن کی اس مذہب کی طرف سے امید دلائی جاتی ہے۔ ان تمام مذاہب میں سچا مذہب بھی ہے اس کے پیروؤں کا بھی یہی حال ہے یہ فرق کیوں ہے؟ اس لئے کہ صرف یقین ہو جانے سے کسی کام کے کرنے کی قابلیت نہیں حاصل ہو جاتی قابلیت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ آہستہ آہستہ اس یقین کے متعلق انسان اپنے اعمال کو بناتا ہے پھر اس کو ایک خاص نور عطا ہوتا ہے جس سے وہ خدا تعالیٰ کا چہرہ دیکھتا ہے۔ پس خالی یقین سے انسان میں قابلیت نہیں پیدا ہو جاتی۔ جس طرح کہ ایک آنکھ کے بیمار کو یہ یقین کہ اس کی آنکھ بیمار ہے گو علاج کی طرف تو توجہ دلا دے گا لیکن اس سے اس کی آنکھ اچھی نہیں ہو جائے گی۔ اسی طرح ایک شخص جو اس دنیا میں اپنی روحانی قابلیت کھو بیٹھا ہے اس کو یہ یقین کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے جو کلام نازل ہوا تھا درست تھا اپنے علاج کی طرف متوجہ کر دے گا مگر اس میں خدا تعالیٰ کو دیکھنے اور اس کے فضلوں کو محسوس کرنے کی قابلیت نہیں پیدا کرے گا۔ یہ قابلیت ایک لمبے عرصہ تک دوزخ میں رہنے کے بعد اور پرانے زنگوں کے جل جانے اور متواتر اللہ تعالیٰ کی صفات پر غور کرنے اور ان کے اثر کو اپنے اندر قبول کرنے کے بعد پیدا ہوگی اور اسی کا نام عرفان ہے۔ یعنی پہچان لینا۔

عدل کا لفظ لغت میں کیوں آیا؟

دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے اگر دوزخ علاج ہے تو یہ رحم ہوگا اور اس طرح سزا بھی رحم ہو گئی پھر عدل کا لفظ کہاں سے لغت میں آیا ہے؟

ہم کہتے ہیں یہ بھی ان لوگوں کو دھوکا لگا ہے۔ اول یہ دعویٰ کہ عدل کا لفظ چونکہ لغت میں آیا ہے اس لئے ضروری ہے کہ خدا بھی عدل کرے یہ غلط ہے کیا ہر لفظ خدا تعالیٰ کے متعلق بنایا گیا ہے؟ اگر یہ درست ہے تو زنا' جھوٹ' فریب وغیرہ الفاظ کہاں سے بن گئے ہیں؟ اسی طرح کیا خدا ظلم کرتا ہے کہ یہ لفظ لغت نے وضع کیا ہے؟ چونکہ یہ کام بندے کرتے ہیں اس لئے یہ الفاظ پیدا ہو گئے ہیں۔

دوم۔ عدل کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کسی کو اس کے اعمال کے مطابق ضرور سزا دی جائے بلکہ

اس کے یہ معنی ہیں کہ کسی کو اس کے اعمال سے زیادہ سزا نہ دی جائے اس لئے ہم کہتے ہیں خدا عدل کرتا ہے اور اس کا یہ مطلب ہے کہ اعمال سے زیادہ کسی کو سزا نہیں دیتا۔

سوم۔ اگر سزا کے سوال کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا جائے تو بھی عدل کے لفظ کی ضرورت باقی رہتی ہے اور خدا تعالیٰ عادل کہلا سکتا ہے کیونکہ اگر کوئی کسی کو خدمت کا پورا بدلہ نہیں دیتا تو یہ بھی عدل کے خلاف ہوتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ چونکہ کسی کے نیک عمل کو ضائع نہیں کرتا وہ عادل کہلا سکتا ہے۔

گناہ پر دلیری

ایک اور اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ کیا اس سے گناہ پر دلیری تو نہیں ہوتی؟ حضرت خلیفہ اول فرمایا کرتے تھے کہ ایک جگہ میں نے بیان کیا کہ گنہگار کی بھی آخر کار نجات ہو جائے گی۔ ایک شخص نے کہا مولوی صاحب! اگر یہ بات ہے تو پھر تو بڑا مزا ہے خوب دل کھول کر گناہ کر لیں آخر نجات ہو جائے گی خواہ سزا کے بعد ہی ہو۔ وہ رئیس آدمی تھا حضرت مولوی صاحب نے فرمایا چلو بازار چل کر دس جوتیاں کھالو اور پھر دس روپے لے لینا۔ وہ کہنے لگا یہ تو نہیں۔ آپ نے فرمایا کیا تم دوزخ کا عذاب برداشت کر لو گے؟ اور دس جوتیاں برداشت نہیں کر سکتے۔

پس یہ غلط ہے کہ اس طرح گناہ کرنے پر جرأت ہو جاتی ہے۔ جب کہ انسان معمولی تکالیف کو برداشت نہیں کر سکتا تو کس طرح ممکن ہے کہ کروڑوں اربوں سالوں کے عذاب کو اس خیال پر اپنے اوپر نازل کر لے کہ آخر نجات تو ہو ہی جائے گی۔

نجات حاصل کرنے والے کی علامتیں

نجات کے متعلق ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کس طرح معلوم ہو کہ انسان نجات حاصل کر رہا ہے؟ میں اس کے لئے چند علامتیں بتاتا ہوں۔ پہلی علامت یہ ہے جو ایک حدیث میں آئی ہے جو حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔ آپ فرماتی ہیں۔ رسول کریم ﷺ یہ دعا کیا کرتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِىْ مِنَ الَّذِيْنَ اِذَا اَحْسَنُوا اسْتَبْشَرُوْا وَاِذَا اَسَاءُوا اسْتَغْفَرُوْا۔ [۴۲]

اے خدا مجھے ان لوگوں میں سے بنا کہ اگر ان سے اچھی بات سرزد ہو تو اس پر خوش ہوتے ہیں اور اگر بری بات سرزد ہو تو اسے ناپسند کرتے ہیں اور استغفار کرتے ہیں۔

پس ایک علامت تو یہ ہے کہ اگر کوئی شخص معلوم کرنا چاہے کہ وہ نجات کی طرف جا رہا ہے یا عذاب کی طرف تو دیکھے کہ کیا جب اس سے نیکی سرزد ہوتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے اگر بدی ہوتی

ہے تو استغفار کرتا ہے یا نہیں؟ اگر بدی کر کے اس کی یہ حالت ہوتی ہے تو وہ باوجود بدی کرنے کے نجات کی طرف جارہا ہے۔

دوسری علامت یہ ہے کہ انسان بدی کو اپنے نفس سے نہ چھپائے۔ قرآن کریم میں آتا ہے وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ ذَکَرُوا اللّٰہَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِھِمْ وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ وَلَمْ یُصِرُّوْا عَلٰی مَا فَعَلُوْا وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ ○ اُولٰٓئِکَ جَزَآؤُھُمْ مَّغْفِرَۃٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ [۴۳] اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اور جو لوگ ایسے ہیں کہ جب ان سے کوئی بدی ہو جاتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتے ہیں اور اللہ کے سوا گناہوں کو معاف بھی کون کر سکتا ہے اور اپنے کئے پر وہ لوگ جان بوجھ کر مصر بھی نہیں ہوتے۔ ایسے لوگوں کا بدلہ یہ ہے کہ ان کو اپنے رب کی طرف سے معافی عطا ہو گی اور ایسی جنتوں میں وہ رکھے جائیں گے کہ ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور کام کرنے والوں کا اجر بہت ہی اچھا ہو گا۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص کے دل میں گناہ کے بعد سچی ندامت پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنے نفس کی اصلاح میں پورے طور پر لگا رہتا ہے اور اس کا دل گناہ کر کے اپنی حرکات کو درست ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کرتا وہ نجات کے راستہ پر چل رہا ہے۔ پس ان امور کا پایا جانا بھی نجات کی ایک علامت ہے۔

تیسری علامت یہ ہے کہ نیکی کر کے طبیعت میں فخر، عجب اور تکبر نہ پیدا ہو۔ اگر نیکی کر کے ایسا نہیں ہوتا تو یہ سمجھے کہ نجات کی طرف جارہا ہے کیونکہ نجات کے معنی قرب الٰہی کے ہیں اور تکبر اور خود پسندی تب ہی پیدا ہوتی ہے جب انسان اپنے سے چھوٹوں میں گھرا ہوا ہو اگر اپنے سے بڑوں کے قرب میں ہو تو اس کے دل میں اپنے کاموں پر فخر اور تکبر نہیں پیدا ہو سکتا۔ پس نیکی پر فخر اور عجب نہ کرنا علامت ہے اس بات کی کہ وہ نجات کی طرف جارہا ہے۔

چوتھی علامت یہ ہے کہ ریاء نہ ہو۔ یعنی یہ خواہش نہ ہو کہ لوگوں کے دکھانے کے لئے کوئی کام کرے۔ پس اگر کوئی شخص محض اللہ کے لئے کام کرتا ہے تو سمجھے کہ نجات کی طرف جارہا ہے کیونکہ نجات اس کام سے ہوتی ہے جو خدا کے لئے کیا جائے اور جو کام جس کے لئے کیا جائے اسی کو دکھانے کی خواہش دل میں ہوتی ہے اور جس شخص کو اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کو اپنے کام دکھانے کی خواہش نہیں وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کے لئے کام کر رہا ہے اور نجات کی طرف جارہا ہے۔

پانچویں علامت یہ ہے کہ دیکھے کہ اس کے دل میں لوگوں کی ہمدردی بڑھتی جارہی ہے یا نہیں؟ اگر یہ ترقی کر رہی ہے تو سمجھے کہ نجات کی طرف جارہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی بچہ ماں باپ سے جدا ہو تو چھوٹے بچے بھی اس کو مارنے لگ جاتے ہیں اور ماں باپ کے سامنے بڑے بھی نہیں مار سکتے۔ نجات کے معنی خدا تعالیٰ کے پاس جانے کے ہیں اور جوں جوں کوئی نجات کے قریب ہوگا خدا کے قریب ہوتا جائے گا اور خدا کے دوسرے بندوں کو تکلیف دینے کی بجائے ان سے محبت کا خیال اس کے دل میں بڑھتا جائے گا۔

چھٹی علامت یہ ہے کہ خدا کے کام کو اپنا کام سمجھے۔ یعنی دین کے کام کو اپنا فرض سمجھے۔ دین کا نقصان ہوتا دیکھ کر اس کو اتنا ہی صدمہ ہو جتنا اپنا نقصان ہونے پر ہو۔ جیسے یہاں ہی پچھلے دنوں نقصان ہوا۔ ایک شخص روپیہ لا رہا تھا جو قومی روپیہ تھا مگر اس سے گم ہو گیا۔ اس پر اگر کوئی ہنسی کرتا ہے تو اس کی حالت خراب ہے۔ پس دینی نقصان کو اپنا نقصان سمجھنا بھی ایک علامت ہے۔

ساتویں علامت یہ ہے کہ اس کے لئے معرفت کی کھڑکی کھولی جاتی ہے اور وہ اپنے دل میں خوشبوئے اتصال پاتا ہے یہ اندرونی احساس ہے۔

آٹھویں علامت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر سن کر اس کا دل ڈر جاتا ہے خواہ کتنے ہی جوش اور غصہ میں ہو خدا تعالیٰ کا جب نام آجائے تو ٹھہر جاتا ہے اور سوچ لیتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے نام کی عظمت کے خلاف تو کام نہیں کرتا؟ اگر کوئی دیکھے کہ خواہ کتنے ہی جوش میں ہوں خدا کا نام آنے پر رک جاتا ہوں اور بلا غور کئے کے آگے نہیں بڑھتا تو سمجھ لے کہ یہ ایمان کی علامت ہے اور یہ کہ وہ نجات کی طرف جارہا ہے۔

نویں علامت یہ ہے کہ اپنی بدیوں پر اطلاع ملنے لگ جائے۔ جب انسان خدا تعالیٰ کے قریب ہوتا ہے تو چھوٹی چھوٹی بدیاں بھی نظر آنے لگ جاتی ہیں اور ساتھ ہی ان کی دلیل بھی معلوم ہو جاتی ہے۔

دسویں علامت یہ ہے کہ ایسے انسان کے لئے نیکیوں کی باریک در باریک راہیں کھولی جاتی ہیں۔ کئی نیکیاں جو اس کے خیال میں بھی نہیں ہوتیں وہ اسے معلوم ہو جاتی ہیں۔

گیارھویں علامت یہ ہے کہ ایسا انسان ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کی قضاء پر خوش ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ کسی مشکل کے آنے پر تدبیریں نہیں کرتا۔ تدبیریں کرتا ہے لیکن اگر وہ نہ

چلیں تو مایوس نہیں ہوتا بلکہ خوش ہی رہتا ہے وجہ یہ کہ جس کو کسی کی دوستی پر اعتماد ہو اس کے متعلق وہ یہ خیال نہیں کرتا کہ وہ اسے ہلاک کرے گا۔ کیا بچہ ماں کے متعلق یہ سمجھتا ہے کہ وہ مار دے گی؟ ہرگز نہیں اسی طرح جو انسان خدا تعالیٰ کی گود میں اپنے آپ کو بچہ کی طرح سمجھتا ہے وہ یہ بھی یقین رکھتا ہے کہ خواہ اس پر کس قدر مشکلات اور مصائب آئیں خدا اسے تباہ نہیں ہونے دے گا۔

نجات سے دور جانے والے کی علامتیں

اب اگر کوئی یہ معلوم کرنا چاہئے کہ کیا میں نجات سے دور جا رہا ہوں تو یہی باتیں الٹ دیکھ لے۔ مثلاً (۱) بدی کرے اور اس پر ندامت نہ ہو اور نیکی کرے تو خوشی نہ ہو۔ (۲) یہ کہ نفس کمزوری اور برائی پر پردے ڈالے گا اور اس کو برائی قرار نہیں دے گا۔ (۳) اگر کوئی نیکی کرے تو نفس اس پر عجب اور فخر کرے۔ (۴) اس کے اعمال میں ریاء ہو گا۔ (۵) لوگوں سے ہمدردی کی بجائے اس کے دل میں بغض بڑھتا جائے گا اور ایسا انسان نجات نہیں پا سکتا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ قدوس ہے اور نجات خدا تعالیٰ سے ملنا ہے اس لئے جو شخص اپنے دل میں کینہ رکھتا ہے وہ کس طرح نجات پا سکتا ہے۔ یاد رکھنا چاہئے دو صفات ایسی ہیں جن میں سے ایک کا کم استعمال برائی ہے اور زیادہ استعمال نیکی اور دوسری صفت کا کم استعمال اچھا ہے اور زیادہ استعمال برا۔ مثلاً غضب کا استعمال جائز ہے مگر بلا وجہ جائز نہیں اور رحم بلا سبب بھی جائز ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ غضب کی صفت مقید ہے اس کا استعمال ہر جگہ جائز نہیں لیکن دوسری صفت ایسی ہے کہ اس کا استعمال اکثر اوقات ضروری ہے اور بعض اوقات جائز اور بہت ہی قلیل موقعوں پر ناجائز۔ پس اگر کوئی شخص دیکھے کہ بری صفت اس کے ساتھ لگی رہتی ہے اور اچھی صفت بہت کم ظاہر ہوتی ہے تو سمجھے کہ میں گندا ہو گیا ہوں اور نجات سے دور جا رہا ہوں (۶) اگر وہ خدا کے کام کو اپنا کام نہ سمجھے۔ مثلاً کوئی دینی نقصان ہو جائے مگر بجائے اس کے کہ اس پر اسے غم ہو وہ طعنے دے اور ہنسی تمسخر کرے تو وہ نجات سے دور جا رہا ہے۔ منافقوں کے متعلق آتا ہے کہ لڑائیوں کے وقت جب مسلمانوں کا نقصان ہوتا تو وہ طعنے دیتے اور ہنسی تمسخر کرتے مگر جہاں محبت ہو وہاں ایسا نہیں کیا جاتا۔ دیکھو اگر کسی کا لڑکا کوٹھے پر سے گر پڑے تو وہ لڑکے پر اعتراض کرنے شروع کر دیتا ہے اس سے تمسخر کرتا ہے یا روتا ہے؟ وہ روتا ہے اعتراض نہیں کرتا۔ پس جس سے محبت ہو اگر اس کا نقصان ہو تو اعتراض کا انسان کے دل میں خیال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ رنج اور غم اور

صدمہ پہنچتا ہے۔ دیکھو اگر کسی کا بچہ جل جائے تو اس وقت ماں بچہ کو یہ نہیں کہتی کہ میں نہ کہتی تھی آگ کے پاس نہ جاؤ بلکہ اس وقت سوائے صدمہ کے اس کے دل میں اور کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوتا (۷) معرفت کی کھڑکی کھلنے کی بجائے اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ دینی علوم اسے نہیں سوجھتے۔ پس ایسا شخص سمجھے کہ میں نیچے جارہاہوں (۸) غصہ اور جوش کی حالت میں خدا تعالیٰ کا نام سن کر ڈر نہ پیدا ہو (۹) موٹی موٹی بدیاں بھی جب اس کی نظر سے چھپتی جائیں تو سمجھے کہ نجات سے دور جارہاہوں (۱۰) نیکیوں کا دروازہ کھلتا نظر نہ آئے (۱۱) خدا کی قضاء پر رنج ہو۔

نجات یافتہ کی علامتیں

اس جگہ یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ پچھلی علامتوں سے انسان یہ تو معلوم کر سکتا ہے کہ میں نجات کی طرف جا رہا ہوں لیکن اسے یہ کیونکر معلوم ہو کہ وہ نجات حاصل کر چکا ہے؟ گو اس کا یہ جواب ہو سکتا ہے اور ہے کہ پہلی باتیں جو بیان کی گئی ہیں جب وہ کثرت سے اور شدت سے پیدا ہو جائیں تو انسان سمجھ لے کہ نجات حاصل ہو گئی ہے لیکن انسانی فطرت چاہتی ہے کہ قیاس سے بڑھ کر علم اسے حاصل ہو اور اس فطرتی تقاضا کو صرف اسلام ہی پورا کرتا ہے اور کوئی مذہب نہیں کرتا۔ نجات یا فلاح اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کر لینے کا نام ہے اور نجات کا یقین کسی کو تب ہی ہو سکتا ہے کہ اسے خدا تعالیٰ کی دوستی اور محبت کے آثار نظر آنے لگ جائیں۔ دیکھو اگر کوئی شخص یہاں بیٹھا ہو اور اسے کہا جائے کہ بادشاہ تم پر خوش ہے تو اسے کس طرح معلوم ہو گا؟ اسی طرح کہ بادشاہ کی خوشنودی کی اسے چٹھی آجائے یا پھر اس طرح کہ بادشاہ سے وہ خود ملے اور وہ اسے بتائے۔ پس دوستی کا تعلق دو طرح ہی معلوم ہو سکتا ہے (۱) قولی طریق سے (۲) عملی طریق سے۔ یعنی یا تو خدا تعالیٰ اپنے منہ سے کہہ دے کہ میں تمہارا دوست ہوں یا اپنے عمل سے اس بات کو ظاہر کر دے اور جس کو یہ بات حاصل ہو جائے اس کو سمجھنا چاہئے کہ اسے نجات کا اصل مقام حاصل ہو گیا ہے ورنہ ڈر ہے کہ اسے نجات کے متعلق دھوکا ہی لگا رہے اور اگلے جہان میں جا کر حقیقت کا پتہ لگے۔

اسلام خدا تعالیٰ کا قولی ثبوت تو یہ پیش کرتا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْہِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔ [۴۴]

خدا تعالیٰ فرماتا ہے جب مؤمن ترقی کرتے کرتے اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں کہ ان کے اس دعویٰ سے کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے کوئی ان کو ہٹا نہیں سکتا وہ مضبوط ہو کر اپنے مقام پر ہمیشہ کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں تو اس وقت ان پر ملائکہ یہ کہتے ہوئے نازل ہوتے ہیں کہ ڈرو نہیں اور

غم نہ کرو اور خوش ہو جاؤ اس جنت پر جس کا تم کو وعدہ دیا جا رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس کو خدا تعالیٰ الہام کے ذریعہ بتا دیتا ہے کہ تم نجات پا گئے اور ملائکہ فوراً اس شخص کی طرف متوجہ ہو کر اس کی خدمت میں لگ جاتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ خدا تعالیٰ جبریل کو فرماتا ہے کہ میں فلاں انسان سے محبت کرتا ہوں تم بھی اس سے محبت کرو [۴۵]۔ پھر جبریل دوسرے فرشتوں کو کہتا ہے کہ فلاں آدمی سے محبت کرو اور وہ کرنے لگ جاتے ہیں۔ پس یہ خدا تعالیٰ کے تعلق اور دوستی کا قولی ثبوت ہے کہ ایسے انسان کو اس دنیا میں الہام ہوتا ہے اور فرشتوں کا نازل ہونا ایسا ہی ہے کہ جب آقا کسی پر مہربان ہو تو اس کے نوکر اس شخص کو راہ چلتے بھی سلام کرتے اور اس کی عزت کرنے لگ جاتے ہیں۔ فرشتے چونکہ خدا تعالیٰ کے دربار کے نوکر ہیں اس لئے جس سے خدا راضی ہوتا ہے اس کے پاس وہ دوڑے آتے ہیں کہ کوئی کار لائقہ بتائیے جسے ہم سر انجام دیں۔

الہام ربانی اور شیطانی میں فرق

اس کے متعلق ایک اور سوال ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ الہام تو شیطانی بھی ہوتے ہیں پھر کس طرح معلوم ہو کہ فلاں الہام ربانی ہے اور فلاں شیطانی؟ اس کے متعلق یاد رکھنا چاہئے کہ الہام الٰہی اور شیطانی الہام میں بہت سے فرق ہیں لیکن ان میں سے ایک موٹا فرق میں اس جگہ بتا دیتا ہوں۔ قرآن کریم میں شیطان کے متعلق آتا ہے وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ○ يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا۔ [۴۶] جو شخص شیطان کو دوست بنا لیتا ہے وہ سخت نقصان اٹھاتا ہے اور گھاٹا پاتا ہے کیونکہ شیطان ایسے لوگوں سے بڑے بڑے وعدے کرتا ہے اور بڑی بڑی تمنائیں ان کے دلوں میں پیدا کرتا ہے لیکن شیطان جو وعدے بھی ان سے کرتا ہے وہ محض دھوکا دہی کے لئے ہوتے ہیں ان کے ساتھ کوئی عملی ثبوت نہیں ہوتا۔

شیطانی الہام میں بہت کچھ کہا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ تو نبی اور رسول ہے خدا کا پیارا ہے مگر اس کو ملتا کچھ بھی نہیں۔ اس کے خلاف خدا تعالیٰ بتاتا پیچھے اور کرتا پہلے ہے۔ اپنے پیارے انسان کو پہلے علوم اور معرفت دیتا ہے پھر کہتا ہے کہ تو نبی ہے تاکہ دھوکا نہ لگے جیسا کہ رسول کریم ﷺ کے پہلے اعمال سے ظاہر ہے۔ شیطانی الہام جن لوگوں کو ہوتے ہیں ان کی ایک مثال بیان کرتا ہوں۔ عبداللہ تیماپوری مدعی ماموریت ایک دفعہ مجھے کہنے لگے کہ مجھے جب ماموریت ملنے لگی تھی اس وقت میں نے حضرت مسیح موعود کی استادی کا حق یاد کر کے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ وہ

آدھا کام حضرت صاحبؑ کی اولاد کے سپرد کرے۔ پس میں اب آپ کے یہ حصہ سپرد کرتا ہوں آپ میرے ساتھ مل جائیں اور آدھا حق آپ لے لیں۔ خواہ تیما پور چلے جائیں میں اس علاقہ میں رہوں خواہ آپ یہاں رہیں اور مجھے کہیں میں تیما پور چلا جاتا ہوں۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ جو کہتے ہیں کہ مجھے حضرت مسیح موعودؑ کا کام پورا کرنے کے لئے خدا تعالیٰ نے کھڑا کیا ہے تو کیا آپ کو خدا تعالیٰ نے کچھ طاقتیں بھی دی ہیں جن کو دیکھ کر انسان آپ پر یقین کر سکے؟ وہ کہنے لگے ہاں بڑے بڑے وعدے کئے ہیں۔ میں نے کہا وعدوں پر آپ کو کون مانے کچھ ملا بھی ہے؟ انہوں نے کہا کہ پیشگوئیاں تو اپنے وقت پر ہی پوری ہونگی۔ میں نے کہا اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ اپنے مأموروں کو دعویٰ سے پہلے ایک ایسی طاقت بخشتا ہے کہ لوگ ان کی برتری تسلیم کر لیتے ہیں۔ رسول کریم ﷺ کے ساتھ اس طرح ہوا' حضرت صالحؑ کی نسبت آتا کُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا[۲۷] تجھ پر سب قوم کو بڑی بڑی امیدیں تھیں' حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے خدا تعالیٰ نے براہین لکھوا کر بڑے بڑے مخالفین سے تعریف کروائی اس کے بعد پھر ان کو مقام مأموریت پر کھڑا کیا۔ اگر نشان پہلے نہ ہو تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کافر بنا کر پھر ایمان کی طرف لانے کی تدبیر کرتا ہے۔ وہ پوچھنے لگے پھر کیا ثبوت میرے پاس ہونا چاہئے؟ میں نے کہا آپ حضرت مسیح موعودؑ کے کام کی تکمیل کے دعویدار ہیں حضرت مسیح موعودؑ کی کتاب براہین احمدیہ بظاہر نامکمل پڑی ہے آپ اس کتاب کو مکمل کر دیں اور انہی علوم کے معیار پر جو اس میں ہیں کتاب میں لکھ دیں پھر کوئی مانے یا نہ مانے میں تو آپ کو مان لوں گا اس پر وہ بالکل خاموش ہو گئے۔ یہ ایک مثال میں نے سنائی ہے اس امر کی کہ شیطانی الہاموں کے ساتھ وعدے ہی وعدے ہوتے ہیں اور آئندہ پورا ہونے کی امید دلائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ پہلے سامان کر کے پھر اس کو آئندہ کے وعدے دیتا ہے یا اعلان وحی کی اس وقت اجازت دیتا ہے جب ان میں سے کچھ حصہ پورا ہو کر لوگوں میں حجت ہو چکا ہوتا ہے۔

ایک اور واقعہ اس قسم کا حضرت مسیح موعودؑ کے وقت کا ہے۔ ایک دفعہ ایک شخص حضرت مسیح موعودؑ کے پاس آیا اور کہنے لگا مجھے یہی آوازیں آتی رہتی ہیں کہ تو محمد ہے' تو عیسیٰ ہے' تو رسول ہے۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کسی سے تمسخر اور مخول نہیں کیا کرتا بلکہ شیطان کرتا ہے کیا جب تم کو عیسیٰ کہا جاتا ہے تو وہ نشانات بھی دیئے جاتے ہیں جو حضرت عیسیٰؑ کو ملے تھے؟ یا جب محمد (ﷺ) کہا جاتا ہے تو کیا آپ ؐ کا علم بھی دیا جاتا ہے؟ کہنے لگا دیا تو کچھ نہیں جاتا صرف الفاظ ہی

سنائی دیتے ہیں- آپؐ نے فرمایا پھر یہ تو تم سے مخول کیا جاتا ہے جو شیطان کرتا ہے- پس شیطانی اور خدائی الہام میں یہ فرق ہے-

خدا تعالیٰ کی فعلی شہادت

اب خدا تعالیٰ کی فعلی شہادت بیان کرتا ہوں- خدا تعالیٰ فرماتا ہے اس مؤمن کو جو خدا تعالیٰ پر ایمان لا کر ترقی ہی کرتا چلا جاتا ہے پیچھے نہیں ہٹتا- فرشتے آکر کہتے ہیں نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَدَّعُوْنَ [۴۸] ہم تمہارے دوست ہیں اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور تم کو آخرت میں جو کچھ تمہارے نفوس خواہش کریں گے ملے گا اور تم جو کچھ وہاں مانگو گے ملے گا-

پس فعلی شہادت خدا تعالیٰ اس طرح دیتا ہے کہ ایسے بندوں کو اس دنیا میں مدد دیتا ہے- یہ شہادت کئی طریق سے دی جاتی ہے-

(۱) ایسے شخص کی دعائیں قبول ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ اس کی بات کو مانتا ہے- اس جگہ دو سوال پیدا ہوتے ہیں میں ان کا جواب دے دینا مناسب سمجھتا ہوں- اول سوال اس فقرہ سے یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان لوگوں کی سب دعائیں سنی جاتی ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں سب دعائیں نہیں قبول کی جاتیں بلکہ بعض دعائیں قبول کی جاتی ہیں اور بعض نہیں قبول کی جاتیں- دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پھر انہی کی دعائیں قبول کی جاتی ہیں اور دوسروں کی نہیں؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ نہیں- دعائیں اللہ تعالیٰ ہر شخص کی قبول کرتا ہے خواہ وہ کافر سے کافر ہی کیوں نہ ہو- ان دونوں سوالوں کے جواب سے ایک تیسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب نہ ان لوگوں کی سب دعائیں قبول کی جاتی ہیں اور نہ ان کو ہی خصوصیت حاصل ہے کہ ان کی بعض دعائیں قبول کی جاتی ہیں تو پھر ان میں اور دوسروں میں فرق کیا ہے؟ اور ان کو دوسرے لوگوں پر کیا امتیاز حاصل ہوتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کی دعاؤں کی قبولیت اور دوسرے لوگوں کی قبولیت میں بہت سے فرق ہیں اور وہ یہ کہ ایسے انسان کی دعائیں کثرت سے سنی جاتی ہیں اور دوسروں کی کوئی کوئی اور یہی دوست اور غیر دوست میں فرق ہوتا ہے- کبھی تو غیر دوست کی بات بھی مان لی جاتی ہے مگر دوست کی دوست اکثر باتیں مانتا ہے-

(۲) اس کو بعض اوقات دعا کی قبولیت الہام یا قلبی اثر کے ذریعہ بتا دی جاتی ہے مگر دوسرے باوجود قبولیت دعا کے شک کے مقام پر رہتے ہیں اور وہ وثوق کے مقام پر ہوتا ہے-

(۳) جب مقابلہ ہوتا ہے تو ایسے انسان کی دعا سنی جاتی ہے اور دوسروں کی رد کی جاتی ہے یہ بھی دوست سے دوست کے سلوک کی مثال ہے۔ یوں تو ہر ایک شخص ہر کسی کی بات مان لیتا ہے لیکن اگر اس کے دوست کے مقابلہ میں آکر کوئی بات منوانا چاہے تو پھر نہیں مانتا۔ اسی بناء پر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سب مذاہب کے پیروؤں کو چیلنج دیا تھا کہ سب مل جاؤ اور مل کر دعا کے ذریعہ مقابلہ کرو پھر معلوم ہو جائے گا کہ خدا تعالیٰ کس کی دعا سنتا ہے اور کس کی رد کرتا ہے۔

(۴) اس کی دعاؤں کی قبولیت خارق عادت طور پر ہوتی ہے۔ جو عام طبعی قانون کو توڑ ڈالتی ہے۔ جیسے حضرت مسیح موعود کی دعا سے ایک لڑکا عبدالکریم دیوانے کتے کے کاٹنے پر بیمار ہو کر بچ گیا حالانکہ ڈاکٹر مانتے ہی نہیں کہ کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

(۵) جس طرح ایک دوست چاہتا ہے کہ دوست اس سے کچھ مانگے اسی طرح خدا تعالیٰ ایسے انسان کو موقع دیتا ہے کہ وہ کچھ مانگے اور پھر اسے دیا جائے۔ حضرت مسیح موعودؑ کا الہام ہے [۴۹]

چل رہی ہے نسیم رحمت کی جو دعا کیجئے قبول ہے آج

اس کا مطلب یہی ہے کہ مانگو۔

دوسری فعلی شہادت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ ایسے انسان کو مدد اور نصرت دیتا ہے مگر اس سے مراد مال و دولت، حکومت و سلطنت نہیں بلکہ یہ ہے کہ جس مقصد کو لیکر وہ کھڑا ہوتا ہے اس میں کامیابی عطا کرتا ہے۔ ایسے لوگوں کو دنیا کے مال و اسباب اور حکومت وغیرہ کی تڑپ ہی نہیں ہوتی بلکہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے تڑپ ہوتی ہے اور یہ پوری ہو جاتی ہے۔ ایسے انسانوں کے متعلق یہ خیال کرنا کہ ان کو مال کیوں نہیں ملتا، حکومت کیوں نہیں ملتی، ایسا ہی امر ہے جیسے کوئی بچہ خیال کرے کہ فلاں شخص کی لوگ عزت کرتے ہیں اس کو لڈو کیوں نہیں دیتے یا کھلونے کیوں نہیں دیتے؟

کہتے ہیں کچھ دیہاتی بیٹھے بحث کر رہے تھے کہ بادشاہ کیا کھاتا ہوگا؟ کوئی کہے فلاں چیز کھاتا ہوگا کوئی کہے نہیں فلاں چیز کھاتا ہوگا۔ ایک بڈھا جو دیر تک خاموش بیٹھا سنتا رہا تھا آخر اس سے نہ رہا گیا اور بے اختیار ہو کر بولا تم لوگ کیسے بے وقوف ہو کہ ان کھانوں کا نام لیتے ہو۔ بادشاہ نے ایک کوٹھڑی گڑ کی ادھر اور ایک ادھر بھروا کر رکھی ہوگی ادھر جاتا ہوگا ایک بھیلی اٹھا کر کھا لیتا ہوگا۔

ادھر جاتا ہو گا تو ایک بھیلی اٹھا کر کھا لیتا ہو گا۔ اب جو شخص یہ کہتا ہے کہ فلاں کی خدا نے کیا مدد کی کہ اسے نہ مال ملا نہ حکومت ملی وہ ایسا ہی ہے جیسے وہ شخص جس نے کہا تھا کہ بادشاہ کے گھر گڑ بھرا پڑا ہو گا۔ خدا تعالیٰ کے پیارے ان باتوں سے بہت اوپر نکل چکے ہوتے ہیں اور ان کی اصل نصرت اور مدد یہی ہوتی ہے کہ ان کا جو مقصد ہوتا ہے وہ پورا ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے مال کا ملنا کوئی کامیابی نہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ۔ نُسَارِعُ لَهُمْ فِى الْخَيْرٰتِ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ۔ [۵۰] کیا گمان کرتے ہیں یہ لوگ کہ مال اور بیٹے جو ان کو دیئے گئے ہیں یہ ان کی خوشی کا باعث ہوں گے یہ تو جانتے ہی نہیں کہ خدا کی محبت کیا چیز ہے۔

پس اصل کامیابی یہ ہے کہ وہ باوجود ساری دنیا کی مخالفت کے اس تعلیم کو جسے لے کر وہ آتے ہیں دنیا میں پھیلا دیتے ہیں حالانکہ لوگ سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ یہ تعلیم دنیا میں پھیل ہی نہیں سکتی۔

تیسری فعلی شہادت یہ ہے کہ اگر ایسے انسان کے دشمن شرارت سے باز نہ آئیں تو ہلاک کئے جاتے ہیں۔ جب دشمن مخالفت میں اس قدر بڑھ جاتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے پیاروں کی ہلاکت کا خطرہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کے دشمنوں کو ہلاک کر دیتا ہے۔

چوتھی فعلی شہادت یہ ہے کہ ایسے انسان سے نیک لوگ محبت کرنے لگ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ نیک انسانوں کو خدا تعالیٰ سے تعلق ہوتا ہے اور جب خدا تعالیٰ اپنے کسی پیارے سے محبت کرتا ہے تو وہ بھی اس سے محبت کرنے لگ جاتے ہیں۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ جب خدا تعالیٰ کسی سے پیار کرتا ہے تو فرشتوں کو اس سے پیار کرنے کا حکم دیتا ہے وہ آگے اوروں کو کہتے ہیں اور ہوتے ہوتے جو لوگ زمین میں نیک ہوتے ہیں ان کے دلوں میں اس کی محبت ڈال دی جاتی ہے۔

یہ مقام نجات کا جس میں انسان کو پورے طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ نجات پا گیا صرف اسلام میں ہی ہے غیر مذاہب والے اس کا دعویٰ بھی نہیں کرتے۔ پس ثابت ہو گیا کہ اسلام ہی یقینی نجات دے سکتا ہے اور دوسرے مذاہب اس سے ادنیٰ درجہ کی نجات بھی نہیں دے سکتے کیونکہ ہر بات کے لئے نمونہ کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ان میں نجات یافتہ کا کوئی نمونہ نہیں۔ پس وہ نجات دینے سے محروم ہیں۔

مدارج کے لحاظ سے نجات کی قسمیں

اب یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مدارج کے لحاظ سے نجات کی دو قسمیں ہیں ایک کو غیر حقیقی کہنا چاہئے اور دوسری کو حقیقی- غیر حقیقی وہ نجات ہے جس میں اس قدر پختگی حاصل نہیں ہوتی کہ انسان اپنی جگہ سے نیچے گرنے سے محفوظ کہلا سکے اسکے متعلق خطرہ ہوتا ہے کہ اس مقام سے گر جائے- اس حالت کا نقشہ قرآن کریم میں اس طرح کھینچا گیا ہے- وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ○ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ- ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ○ [۵۱] خدا تعالیٰ فرماتا ہے- ان کو سنا اس شخص کا حال جس کو ہم اپنے نشان دیتے ہیں (یہ نجات پر ہی ملتے ہیں) پھر وہ اس طرح ہمارے نشانوں کو چھوڑ کر الگ ہو جاتا ہے جس طرح سانپ اپنی کینچلی اتار کر پھینک دیتا ہے اور خالی کا خالی نکل جاتا ہے- اس وقت شیطان اس کے پیچھے ہو لگتا ہے اور وہ ہلاک ہونے والوں میں سے ہو جاتا ہے- اگر ہم پسند کرتے (یعنی یہ دیکھتے کہ یہ ہماری نصرت کے استحقاق کو کھو نہیں بیٹھا) تو اسے انہی نشانوں کے سہارے اس مقام پر لے جاتے جہاں وہ اس خطرہ سے محفوظ ہو جاتا مگر وہ زمین کی طرف جھک گیا اور اپنی خواہشات کا مطیع ہو گیا اور اس کی مثال کتے کی سی ہو گئی جس کے پیچھے دوڑو تو بھی اپنی زبان نکال لیتا ہے اور نہ دوڑو تو بھی- یعنی اس کے اخلاق پھر اس طرح گر جاتے ہیں کہ وہ مقابلہ ہو یا نہ ہو بے وجہ ہی لوگوں پر اپنی زبان دراز کرتا رہتا ہے-

ان آیات سے یہ باتیں معلوم ہوتی ہیں-

(۱) بعض انسان آیات کے حصول کے بعد بھی گر جاتے ہیں-

(۲) اس گرنے کا سبب ان کے نفس سے پیدا ہوتا ہے- شیطان ان کے گرنے کے بعد آتا ہے نہ کہ شیطان کے سبب سے وہ گرتے ہیں- وہ ایسے مقام پر پہنچ چکے ہوتے ہیں کہ شیطان وہاں نہیں جا سکتا- وہاں ان کا نفس ہی ہوتا ہے جو انہیں نیچے گراتا ہے-

(۳) ان کے گرنے کے بعد شیطان ان کے پیچھے پڑ جاتا ہے کیونکہ اس وقت وہ اس کے اثر کے حلقہ میں آجاتے ہیں-

(۴) یہ گرنا دنیاوی اغراض اور فوائد کی وجہ سے ہوتا ہے جیسا کہ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ سے ظاہر ہے-

(۵) ایسے لوگوں کے اخلاق بہت بگڑ جاتے ہیں۔

اب بھی دیکھو جن لوگوں کو احمدیوں میں سے ابتلاء آیا ہے ان میں یہ سب باتیں پائی جاتی ہیں۔ ہم انہیں کچھ کہیں یا نہ کہیں وہ ہمیں گالیاں دیتے جاتے ہیں۔ میں اگر کچھ لکھوں تو بھی مولوی محمد علی صاحب گالیاں دینے لگ جاتے ہیں اور اگر نہ لکھوں تو بار بار چھیڑتے ہیں کہ بولتا کیوں نہیں؟

اس آیت سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ ایسا بھی مقام ہے کہ جہاں شیطان نہیں پہنچ سکتا مگر نفس وہاں بھی ساتھ جاتا ہے۔

حقیقی نجات

نجات حقیقی کے متعلق قرآن کریم کہتا ہے قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ [۵۲] اے محمد (ﷺ) تو کہہ دے کہ میری نماز، میری قربانی، میری زندگی، میری موت سب اللہ ہی کے لئے ہے جو رب العالمین ہے۔ میرا ان میں کوئی دخل نہیں۔

یہ حقیقی نجات ہے۔ پہلی آیت سے پتہ لگتا ہے کہ نفس نیچے لانے والا ہوتا ہے مگر یہاں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب کچھ خدا کا ہی ہو جاتا ہے حتیٰ کہ نفس بھی اپنا نہیں رہتا۔ یہی مقام ہر انسان کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

یہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ نفس سے کیا مراد ہے۔ نفس کا لفظ جو برے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اس سے مراد وہ ملکہ بدی کا ہے جو بدیاں کر کر کے انسان کے اندر پیدا ہو جاتا ہے ورنہ نفس جو فطرت کا نام ہے وہ اور شئے ہے۔

مختلف مذاہب کے نزدیک نجات

آرین مذہب کے نزدیک یہ دنیا دوزخ ہے اور جب اس سے علیحدگی ہوگی تو نجات ہو جاتی ہے کیونکہ وہ لوگ یہ مانتے ہیں کہ جونیں عذاب ہیں اور ان کے نزدیک تمام اعمال کی سزا اسی دنیا میں ملتی ہے۔ بدھوں کا نقطہ خیال یہ ہے کہ دنیا دکھ کی جگہ ہے لیکن انسان کے دل میں خواہشات پیدا ہو کر اس کو بار بار دنیا میں لاتی ہیں اور ان خواہشات کے ترک کر دینے سے وہ اس عذاب سے بچ جاتا ہے جینیوں کے نزدیک یہ ہے کہ دنیا میں انسان اس لئے آتا ہے کہ بعض روحوں کو مادہ چمٹ جاتا ہے اور دنیا میں آنے کی مثال ایسی ہے جیسا کہ کانٹوں میں کپڑا پھنس جائے۔ ایک طرف سے چھڑایا جائے تو دوسری طرف پھنس جائے سب طرف سے چھٹ جانا مکتی ہے لیکن ان کے نزدیک اس

دنیا کے علاوہ اور جہنمیں بھی ہیں جہاں انسان دو جونوں کے درمیان رکھا جاتا ہے۔ برہمن مذہب کے نزدیک اعمال کے اثر سے انسان دنیا میں آتا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی علاوہ اس دنیا کے اور مقامات بھی عذاب کے ہیں۔ ان میں اور جینیوں اور بدھوں میں یہ فرق ہے کہ جینی مادہ کے بوجھ کے سبب سے بدھ خواہشات کے سبب سے اس دنیا میں آنا مانتے ہیں لیکن برہمن مذہب والے اعمال کی جزاء کے لئے واپسی مانتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی طرف اسے منسوب کرتے ہیں۔ یورپ کے نئے لوگ بھی تناسخ کے تو قائل ہیں لیکن وہ اسے عذاب نہیں قرار دیتے بلکہ اس کو ترقی کا میدان سمجھتے ہیں پس ان کے نزدیک نجات یہیں مل جاتی ہے۔ یہودی مذہب، عیسائیت، زرتشتی، شنٹو مذہب اور اسلام یہ پانچ مذاہب ایسے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ انسان اس دنیا میں اعمال کر جاتا اور اس کا حقیقی بدلہ اگلے جہان میں اس کو ملتا ہے گو جزاء اسی دنیا سے شروع ہو جاتی ہے۔

تناسخ

ان خلاصوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے مذاہب میں سے ایک معتد بہ حصہ اس امر کا قائل ہے کہ انسان عذاب اسی دنیا میں تناسخ کی شکل میں پالیتا ہے۔ پس اس عقیدہ پر ایک تنقیدی نظر ڈالنا ضروری ہے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ جو مذاہب تناسخ کو مانتے ہیں وہ کہتے ہیں انسان جو مختلف حالات میں پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً کوئی امیر ہوتا ہے کوئی غریب، کوئی صحیح و سالم ہوتا ہے کوئی لنگڑا لولا، کوئی عقلمند ہوتا ہے کوئی بے وقوف، کوئی چست ہوتا ہے کوئی ست، کوئی طاقت ور ہوتا ہے کوئی کمزور، غرض انسانوں کی مختلف حالتیں ہوتی ہیں اور بلحاظ جسم، عقل اور متعلقات کے انسانوں میں فرق ہوتا ہے۔ یعنی بعض طاقتور ہوتے ہیں اور بعض کا جسم کمزور ہوتا ہے، بعض کی عقل تیز ہوتی ہے اور بعض کی کمزور، بعض مالدار ہوتے ہیں، بعض غریب، پھر بعض بیماروں کے ہاں پیدا ہوتے ہیں بعض تندرستوں کے، بعض عالموں کے ہاں پیدا ہوتے ہیں بعض جاہلوں کے، بعض مالداروں کے ہاں پیدا ہوتے ہیں بعض غریبوں کے، غرض یہ تین قسم کے تفاوت یعنی جسمانی، عقلی اور مالی ہمیں بنی نوع انسان میں ملتے ہیں یہ تو ابتداء کا حال ہے۔

درمیانی زندگی میں بھی ہمیں کئی تفاوت نظر آتے ہیں۔ بعض لوگ بلا سبب اور بلا وجہ ناکامیابی کا منہ دیکھتے ہیں بعض معمولی کوشش سے کامیاب ہو جاتے ہیں۔

انجام میں بھی یہی تفاوت ہے بعض لوگ اپنے کاموں کو ختم کر کے مرتے ہیں۔ بعض لوگ

اعلیٰ مقاصد اور ترقی کے لئے جدوجہد کرتے ہوئے اچانک مرجاتے ہیں اور ان کے اچھے کام بغیر ختم ہونے کے درمیان ہی میں رہ جاتے ہیں۔ اگر زندگی کا کوئی مقصد ہے تو اس کا کیا مطلب ہے اور کیا توجیہہ؟ ان اختلافات کی تین وجہیں بیان کی جاسکتی ہیں۔

(۱) انسان اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس حالت اختلاف میں پیدا کیا جاتا ہے یہی اس کی وجہ ہے۔

(۲) یا یہ کہ یہ اختلاف والدین سے ورثہ میں ملتا ہے۔

(۳) پچھلے اعمال کا نتیجہ ہے۔

ان توجیہوں میں سے کونسی درست ہے؟ ان میں سے پہلی اور دوسری بات کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ یہ قانون قدرت کے خلاف ہیں کیونکہ ان کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ گویا انسان کو اپنے اعمال پر مقدرت نہیں ہے۔ اگر خدا نے انسان کو ان مختلف حالتوں میں بلا سبب پیدا کر دیا ہے یا انسان کو تفاوت ماں باپ سے ورثہ میں ملتا ہے تو اس صورت میں ماننا پڑے گا کہ انسان کو اپنے اعمال پر قدرت نہیں کیونکہ خدا کا فعل یا اس کے ماں باپ کی حالت اسے بعض خاص حالتوں پر مجبور کر کے چلاتی ہے۔ اگر یہ بات درست ہے تو پھر اس کو سزا کیوں ملے گی؟ جب خدا نے ہی ایک انسان کو اچھا یا برا بنایا تو پھر اس کی جزاء یا سزا کیسی؟ ایک شخص کو خدا نے شریروں میں پیدا کیا اور وہ شریر ہوا۔ ایک کو نیکوں میں پیدا کیا وہ نیک ہوا پھر ایک کو سزا اور دوسرے کو انعام کیسا؟ آپ ہی اچھا یا برا پیدا کیا تو پھر یہ عجیب بات ہوگی اگر سزا بھی اور انعام بھی دے گا اور اگر کہا جائے کہ خدا نہیں ایسا پیدا کرتا بلکہ یہ باتیں اسے ورثہ میں ملتی ہیں۔ تب بھی اس کے یہی معنی ہوں گے کہ انسان مجبوری کی حالت میں ہے اور جب وہ مجبور ہے تو اس پر الزام کیسا؟ اور اس کے لئے انعام یا سزا کیوں؟ کیونکہ اعمال میں اس کا دخل ہی نہ تھا۔

دوسرا اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا ماننے سے خدا کے انصاف پر الزام آتا ہے کہ کیوں اس نے اپنے بندوں میں تفاوت کیا۔ اس کا تعلق چاہتا تھا کہ وہ سب سے ایک سا ہی معاملہ کرتا۔

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ ہر بات جو اس دنیا میں ہمیں نظر آتی ہے وہ بلا سبب نہیں پس یہ کہہ دینا کہ یہ تغیر اس لئے ہے کہ خدا نے یونہی چاہا درست نہیں۔ کوئی ظاہری یا عقلی سبب اس کا موجود ہونا چاہئے جو سوائے تناسخ کے اور نہیں ہو سکتا۔

چوتھا اعتراض یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح دنیا میں کوئی بات بلا سبب نہیں اسی طرح کوئی بات بلا نتیجہ بھی نہیں۔ لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ جو شخص کسی اہم کام کو ادھورا چھوڑا کر مرجاتا ہے وہ اس لئے مرجاتا ہے کہ خدا نے یونہی چاہا تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اس شخص کی زندگی بے نتیجہ رہی اور یہ بات عام قانون قدرت کے خلاف ہے۔ پس اس قسم کے حادثات کا بھی ایک ہی حل ہے کہ وہ لوگ تناسخ کی وجہ سے ان حالتوں میں مرجاتے ہیں تاکہ دوسری شکل میں اپنی ترقی کو جاری رکھیں۔

ان تمام اعتراضات کو پیش کر کے تناسخ کے ماننے والے کہتے ہیں کہ چونکہ دوسری وجوہ تو دلائل سے رد ہو جاتی ہیں اس لئے تیسری یہی وجہ ماننی پڑے گی کہ انسان کے پچھلے اعمال کے سبب یہ سب اختلاف ہے۔

ان کے اس دعویٰ کو یورپ کے بعض لوگوں کے بیانات سے بھی تقویت مل جاتی ہے جو ان کا نام تجربہ رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم روحوں سے باتیں کرلیتے ہیں اور ان سے سوالات حل کرا لیتے ہیں۔ روحوں سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تناسخ درست ہے۔ یہ لوگ سپرچولسٹ (SPIRITUALIST) کہلاتے ہیں اور یورپ اور امریکہ میں ان کا آج کل بڑا زور ہے۔

ابطال تناسخ یہ خلاصہ ہے قائلین تناسخ کے دلائل کا۔ اب میں ان باتوں کے جواب دیتا ہوں۔(۱) اس ساری عمارت کی بنیاد ہی شک پر ہے۔ ہر مسئلہ کی بنیاد علم پر ہوتی ہے مگر تناسخ کا مسئلہ ایسا ہے جو شک سے پیدا ہوتا ہے اور اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے کوئی شخص رات کو کہیں جارہا ہو ایک اور شخص اسے دیکھے اور کہے کہ چونکہ یہ رات کو گلیوں میں جارہا ہے اور رات کو گلی میں پھرنے کی کوئی وجہ ہونی چاہئے اس لئے یہ ضرور چور ہے۔ مگر یہ خیال اس کا شک ہوگا ممکن ہے کہ وہ چور ہو اور ممکن ہے کہ وہ کسی ضروری کام کے لئے جارہا ہو۔ مثلاً کوئی گھر میں بیمار ہو اور یہ ڈاکٹر کو بلانے جاتا ہو یا ریل کا وقت ہو اور یہ گاڑی میں سوار ہونے جاتا ہو۔ یا مثلاً کوئی شخص ایک وسیع مکان بنانے لگے ایک اور شخص آکر دیکھے اور کہے چونکہ یہ بہت بڑا مکان بنا رہا ہے اور اس کے گھر کے آدمی اتنے نہیں ہیں جن کے لئے اتنے وسیع مکان کی ضرورت ہو اور ایسا مکان بنانے کی کوئی وجہ ہونی چاہئے جو یہ ہے کہ یہ شخص منصوبہ باز ہے۔ اس جگہ اس کے ساتھی جو اس کے ساتھ سازش میں شریک ہیں جمع ہوا کریں گے اور یہ سمجھ کر اس کو گرفتار کرانے کی کوشش

کرے۔

تناسخ کو ماننے والوں کا طریق بالکل اسی کے مشابہ ہے۔ وہ کہتے ہیں انسانوں کی حالتوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کی کوئی وجہ ہونی چاہئے اس کے بعد آپ ہی آپ اس کی یہ وجہ گھڑ لیتے ہیں کہ یہ پچھلی جون میں جیسے کام کرتے تھے ویسے ہی آج ان کو بدلے ملتے ہیں پس تناسخ درست ہے۔ ہم کہتے ہیں یہ تو ٹھیک ہے کہ اس کی کوئی وجہ ہونی چاہئے مگر یہ کس طرح معلوم ہوا کہ اسکی یہی وجہ ہے کہ تناسخ کے باعث ایسا ہوا ہے۔ اس کی بھی کوئی دلیل ہونی چاہئے کہ صرف تناسخ کے سبب سے ایسا ہوتا ہے۔ تناسخ کو ثابت کرنے کے لئے صرف یہ ثابت کر دینا کافی نہیں کہ انسانوں کے اختلاف کی کوئی وجہ ہونی چاہئے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ثابت کیا جائے کہ تناسخ ہی اس کی وجہ ہے۔

اب میں تفصیلاً ان کے اعتراضات کے جواب دیتا ہوں۔ پہلا اعتراض یہ تھا کہ اگر یہ مانا جائے کہ خدا تعالیٰ نے لوگوں کو مختلف الحالات ہی پیدا کیا ہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ انسان کو اپنے اعمال پر قدرت نہیں کیونکہ جب اس کو بلا سبب کم طاقتیں دے کر بھیجا گیا ہے تو وہ کم ہی کام کرے گا اور پھر مواخذہ کے نیچے آجائے گا۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ یہ نتیجہ جو نکالا گیا ہے درست نہیں۔ مقدرت اس سے جاتی نہیں رہتی۔ مقدرت اس صورت میں جاتی رہتی اگر اللہ تعالیٰ یہ فیصلہ فرماتا کہ زیادہ عمل کرنے والے کو زیادہ اجر ملے گا اور کم والے کو کم مگر یہ خدا تعالیٰ نے فیصلہ نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ○ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ٍۨالْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ [۵۳] یعنی ہم اپنے علم سے لوگوں کے سامنے ان کے تمام حالات بیان کریں گے اور ہم کبھی بھی ان لوگوں سے غائب نہیں ہوتے اور اس دن وزن حق ہو گا۔ پس جو شخص کہ ایسا ہو گا کہ اس کا بوجھ زیادہ ہو گا وہ کامیاب ہو جائے گا۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اعمال کی بناء پر نہیں بلکہ وزن کی بناء پر نجات ہو گی اور وزن سے مراد تمام امور کا خیال ہے جن کی بناء پر کسی امر کی قیمت لگائی جاتی ہے۔ پس جب کہ ہر اک انسان کے اعمال کو دیکھتے وقت اس امر کا لحاظ رکھا جائے گا کہ اس نے کن حالات میں، کن مشکلات میں یا کن اثرات کے نیچے یہ کام کیا تھا تو مقدرت میں فرق تو نہ آیا کیونکہ ایک غریب آدمی ایک امیر کے برابر اخلاص رکھتا ہے اور اپنی طاقت کے مطابق دینی خدمات بجالاتا ہے اور اس کے اخلاص کو وزن کر کے نہ کام کو اللہ تعالیٰ بدلہ دیتا ہے تو پھر عدم

مقدرت کا الزام کہاں باقی رہا۔ مدارج کے اختلاف کا جو اثر عمل پر پڑتا ہے یا سمجھ پر پڑتا ہے اس کا خدا تعالیٰ اندازہ کر کے ہی جزاء دیتا ہے۔

مقدرت کا فرق تب اعتراض بنتا کہ اگر فیصلہ خدا تعالیٰ نے جو ذرہ ذرہ کو جانتا ہے نہ کرنا ہوتا بلکہ انسانوں نے کرنا ہوتا جو بوجہ علم کی کمی کے صحیح موازنہ نہیں کر سکتے کہ کسی شخص کے کاموں میں کہاں تک اس کے حالات کا دخل ہے اور کہاں تک اس کے اپنے ارادہ کا دخل ہے۔ درحقیقت یہ اعتراض پیدا ہی اللہ تعالیٰ کی طاقتوں کے غلط اندازہ سے ہوا ہے اگر خدا تعالیٰ کی صفات کو مدنظر رکھا جاتا اور انسان کی طاقتوں پر اس کی طاقتوں کا خیال نہ کیا جاتا تو یہ دھوکا کبھی نہیں لگ سکتا تھا۔

پس یہ درست ہے کہ انسانوں کی حالتوں میں اختلاف ہے۔ ایک کمزور' ایک طاقتور' ایک اعلیٰ علمی قابلیتوں والا ایک موٹے دماغ کا' ایک بہت سے سامان رکھتا ہے'۔ ایک تہی دست ہے' ایک ایسے لوگوں میں پیدا ہوتا ہے جو ہدایت یافتہ ہیں' ایک ایسا ہے جو گمراہوں میں پیدا ہوتا ہے لیکن ساتھ یہ بھی درست ہے کہ جس طرح ہمیں یہ بات معلوم ہے کہ مختلف لوگ مختلف حالات میں پیدا ہوتے ہیں یہ بات اس پیدا کرنے والے کو بھی معلوم ہے اور ہم سے بڑھ کر معلوم ہے اور پھر مزید برآں یہ بات ہے کہ وہ ان تمام اختلافوں اور ان کے اثر کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ کس کو کس قدر اور کس قسم کا بدلہ دینا چاہئے۔ پس یہ اعتراض کوئی اعتراض نہیں۔

اس امر کی مثالیں کہ ان طبعی روکوں کا جن کو انسان نے پیدا نہیں کیا لحاظ رکھ لیا جائے گا قرآن کریم اور احادیث سے بہت سی ملتی ہیں۔ ایک دوسری جگہ پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا يَسْتَوِى الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِى الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً- وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا- دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا [۵۴] مومنوں میں سے ایسے شخص جن کو کوئی طبعی روک نہیں اور باوجود اس کے گھروں میں بیٹھ رہتے ہیں اور وہ جو خدا تعالیٰ کے راستہ میں مالوں اور جانوں کی قربانیاں کرتے ہیں برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو اپنے مالوں اور جانوں کو خدا کی راہ میں قربان کرتے ہیں مذکورہ بالا قسم کے گھر بیٹھ رہنے والوں پر درجہ میں بلند کیا ہے اور ہر اک سے اللہ تعالیٰ نے نیکی کا وعدہ کیا اور اللہ نے مجاہدوں کو گھر بیٹھنے والوں پر بہت

بڑے اجر کے ساتھ فضیلت دی ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ صرف وہ لوگ مجاہدوں سے درجہ میں کم ہوں گے جو طاقت رکھتے ہوئے سستی کرتے ہیں لیکن وہ لوگ جو طاقت نہیں رکھتے وہ اگر دل سے خواہش رکھتے ہوں تو اللہ کے رستہ میں جہاد کرنے کے لئے نکلنے والوں کے برابر ہی ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ ہر ایک انسان کی مجبوریوں کو مدنظر رکھے گا اور ان کا لحاظ رکھ کر بدلہ دے گا۔ حدیثوں میں اس کی تصریح موجود ہے۔ چنانچہ بخاری اور مسند احمد میں انس ؓ کی روایت ہے۔ کہ اِنَّ بِالْمَدِيْنَةِ اَقْوَامًا مَا سِرْتُمْ مِنْ سَيْرٍ وَلَا قَطَعْتُمْ مِنْ وَادٍ اِلَّا وَهُمْ مَعَكُمْ فِيْهِ قَالُوْا وَهُمْ بِالْمَدِيْنَةِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ حَبَسَهُمُ الْعُذْرُ [55] یعنی ایک دفعہ رسول کریم ﷺ ایک جنگ کے لئے جا رہے تھے راستہ میں آپ نے فرمایا کہ کچھ لوگ مدینہ میں ایسے ہیں کہ تم کوئی سفر طے نہیں کرتے اور نہ کوئی وادی طے کرتے ہو کہ وہ تمہارے ساتھ ہوتے ہیں (یعنی تمہارے برابر ثواب پالیتے ہیں) صحابہ ؓ نے کہا یا رسول اللہ باوجود اس کے کہ وہ مدینہ میں بیٹھے ہیں؟ آپ ؐ نے فرمایا ہاں کیونکہ ان کو عذر نے روکا ہوا ہے۔ (ورنہ دل سے وہ چاہتے تھے کہ جنگ میں ساتھ جائیں)

اس حدیث سے کس وضاحت سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے نزدیک اختلاف حالات کو سزاء جزا دیتے وقت اللہ تعالیٰ مدنظر رکھ لے گا۔ حتیٰ کہ ایک اگر عذر کی وجہ سے گھر بیٹھ رہتا ہے تو وہ انہی لوگوں کے ساتھ سمجھا جاتا ہے جو جہاد میں حصہ لیتے ہیں۔

اسی طرح قرآن کریم میں آتا ہے لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاۤءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ [56] اللہ تعالیٰ فرماتا ہے دیکھو ان احکام کو پورا کرنے کی جو لوگ طاقت نہیں رکھتے ان سے پوچھا نہیں جائے گا اور نہ ان سے جو مریض ہوں اور نہ ان سے جن کے پاس روپیہ نہیں جب کہ ان کے دل میں نیت ہو کہ اگر یہ عذر نہ ہوں تو ہم بھی ایسا ہی کریں۔

اسی طرح آتا ہے لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاۤؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ☆ [57]۔ پہلی آیت میں جن عذروں کا ذکر ہے وہ جسمانی ہیں۔ اس آیت میں مالی کمزوریوں کے متعلق فرماتا ہے یہ نہ سمجھنا کہ فلاں نے اتنا مال دیا ہے اور ہم نے اس سے اتنا زیادہ دیا ہے خدا کو مال نہیں پہنچتا بلکہ وہ چیز پہنچتی ہے جو دلوں میں ہوتی ہے۔ جس کے پاس تقویٰ ہو اس کی اٹھنی بھی

اس شخص کے سو روپیہ سے زیادہ قدر رکھتی ہے جو تقویٰ سے خالی ہو۔

پس یہ کہنا کہ ایک شخص مالدار ماں باپ کے ہاں پیدا ہو کر زیادہ ثواب حاصل کر سکتا ہے جب کہ ایک دوسرا شخص غریب والدین کے ہاں پیدا ہو کر ثواب سے محروم رہ جاتا ہے غلط ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کے حضور غریب کا ایک پیسہ مالدار کی بہت بڑی رقم کے برابر سمجھا جائے گا اگر ان دونوں نے اپنی اپنی طاقت کے مطابق صدقہ دے دیا ہے۔ پس نہ امیر کی رعایت ہے نہ غریب پر ظلم ہے۔

اس جگہ یہ اعتراض پڑ سکتا ہے کہ مان لیا کہ جزاء سزا پر اس اختلاف حالات کا کوئی اثر نہیں پڑتا لیکن اس میں کیا شک ہے کہ اس اختلاف حالات سے ایک کو تکلیف ہوتی ہے دوسرے کو آرام ملتا ہے۔ خدا تعالیٰ ایسا کیوں کرتا ہے؟ گو اس اعتراض کا تناسخ سے کوئی تعلق نہیں لیکن میں اس کا بھی جواب دے دیتا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس انتظام کے ماتحت بعض کو تکلیف ہوتی ہے اور بعض آرام سے رہتے ہیں لیکن یہ تکالیف قانون قدرت کے ماتحت آتی ہیں نہ کہ قانون شریعت کے ماتحت۔ مگر باوجود اس کے احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رحیم و کریم خدا نے بندہ کی اس تکلیف کا بھی خیال رکھا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ مَا یَزَالُ الْبَلَاءُ بِالْمُؤْمِنِ وَالْمُؤْمِنَۃِ فِیْ نَفْسِہٖ وَوَلَدِہٖ وَمَالِہٖ حَتّٰی یَلْقَی اللّٰہَ تَعَالٰی وَمَا عَلَیْہِ خَطِیْئَۃٌ ☆☆[۵۷] یعنی خدا پر ایمان لانے والے کو کوئی تکلیف نہیں پہنچتی خواہ اس کی جان کے متعلق، خواہ اولاد، خواہ مال کے متعلق کہ اس کے بدلہ میں جب وہ خدا سے ملتا ہے تو اس کے گناہوں کو معاف کر دیا جاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ قانون قدرت کے ماتحت بھی جو تکالیف پہنچ جاتی ہیں ان کا بدلہ انسان کو مل جاتا ہے اور جب بہتر بدلہ مل گیا تو اعتراض نہ رہا۔ اب بتاؤ جو شخص لنگڑا ہو اسے اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس وجہ سے میں جنت کے قریب ہو گیا ہوں تو وہ ضرور کہے گا کہ مجھے اس حالت کی کوئی پرواہ نہیں کیونکہ اخروی انعامات اعلیٰ ہیں۔

حدیثوں میں آتا ہے کہ کچھ صحابیؓ کفار کے مظالم کی وجہ سے حبشہ چلے گئے تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ امن ہو گیا ہے تو واپس آ گئے۔ ان میں سے ایک شخص کو ایک رئیس نے اپنی پناہ میں لے لیا۔ وہ جس کو پناہ میں لیا گیا تھا اس نے ایک دن دیکھا کہ ایک کافر ایک مسلمان کو مار رہا ہے اس نے جا کر رئیس کو کہہ دیا کہ میں آئندہ آپ کی پناہ میں نہیں رہتا میں یہ نہیں برداشت کر سکتا کہ دوسرے مسلمان ماریں کھائیں اور میں آپ کی پناہ کی وجہ سے بچا رہوں اس کی پناہ سے نکلنے کے بعد ایک دن کفار ایک مجلس میں بیٹھے تھے کہ ایک شاعر نے اپنے شعر سنانے شروع کئے جن

میں سے ایک شعر یہ تھا۔

اَلَا کُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلُ وَ کُلُّ نَعِيْمٍ لَا مَحَالَةَ زَائِلُ

ترجمہ! سنو ہر ایک چیز سوا اللہ کے ہلاک ہونے والی ہے اور ہر ایک نعمت آخر ضرور ضائع ہو جانے والی ہے۔ اس پر اس صحابی نے کہا یہ غلط ہے جنت کی نعمتیں کبھی ضائع نہیں ہوتیں۔ چونکہ عربوں میں بڑوں کا ادب بہت کیا جاتا تھا اس شاعر نے بہت شور مچایا اور کہا کہ اے مکہ کے شرفاء! تم میں پہلے تو مہمان کو اس طرح ذلیل نہیں کیا جاتا تھا۔ اس پر طیش میں آکر ایک کافر نے اس صحابی کو زور سے مُکّا مارا کہ اس کی ایک آنکھ کو سخت صدمہ پہنچا۔ اس مجلس میں وہ شخص بھی بیٹھا ہوا تھا جس نے اس صحابی کو اپنی پناہ میں لے رکھا تھا اس نے کہا میری پناہ میں سے نکلنے کا کیا نتیجہ نکلا اب بھی وقت ہے تو میری پناہ میں آجا۔ صحابیؓ نے کہا میری ایک آنکھ کو اگر تکلیف ہوئی تو کیا پرواہ ہے کیا تو سمجھتا ہے کہ میں اس سے تیری پناہ میں آجاؤں گا؟ میری تو دوسری آنکھ بھی انتظار کر رہی ہے کہ خدا کی راہ میں اس کو بھی وہی دکھ پہنچے جو پہلی کو پہنچا ہے۔[۵۸]

اس واقعہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جن لوگوں کو یقین ہو کہ ہماری تکالیف کا نیک بدلہ ملنے والا ہے وہ ان تکالیف کو تکالیف ہی نہیں سمجھتے۔

بغیر تناسخ کے خدا کے عدل پر اعتراض پڑتا ہے

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اگر یہ نہ تسلیم کیا جائے کہ اختلاف حالات پچھلے اعمال کے بدلہ میں تھا تو اس سے خدا تعالیٰ کے عدل پر حرف آتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک اگر روحیں آزاد شئے ہیں اور کہیں سے پکڑ کر خدا تعالیٰ نے انسان کے جسم میں ڈال دی ہیں تو بے شک اس کے انصاف پر حرف آتا ہے۔ لیکن اگر روحیں انسانی جسم سے ہی پیدا ہوتی ہیں اور بیٹے کی روح اس نطفہ سے ہی پیدا ہوتی ہے جو باپ سے پیدا ہوتا ہے تو اس میں ان قوتوں کا پیدا ہونا جو باپ میں تھیں اور اس کا پیدا ہو کر ان حالات کا وارث ہونا جو باپ کو میسر تھے ایک قدرتی امر ہے اس میں کوئی ظلم نہیں اور جب کہ عقل سلیم صریح طور پر اس امر کی تصدیق کرتی ہے تو اعتراض صرف بے عقلی کا نتیجہ رہ جاتا ہے۔

دوم یہ کہ جیسا کہ پہلے ثابت کیا جا چکا ہے ہر ایک تغیر کا بدلہ انسان کو مل جاتا ہے۔ پس جب کہ دنیوی تکالیف کا بدلہ بھی انسان کو مل جائے گا تو اس تغیر کے سبب سے خدا تعالیٰ پر اعتراض کیونکر وارد ہوا؟

ہر اک بات کا کوئی سبب ہونا چاہئے

تیسرا اعتراض یہ تھا کہ دنیا کی ہر اک بات کا کوئی سبب ہونا چاہئے پھر اس اختلاف حالات کا کیا سبب ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا سبب یہ ہے کہ انسانی ترقی کے لئے ضروری تھا کہ ہر ایک چیز کچھ اثر اپنے اندر رکھے اور کچھ تاثیر- اگر یہ دونوں قوتیں مٹادی جائیں تو کل کارخانہ عالم تباہ ہو جاتا ہے- پس ان دونوں قوانین کے ماتحت جو بچہ ماں باپ کے ہاں پیدا ہوتا ہے وہ ان کے حالات سے متأثر ہوتا ہے اور اس تغیر کا سبب یہی ہے کہ جن کے گھر میں وہ پیدا ہوا تھا وہ ان حالات میں گذر رہے تھے- ایک شخص جو زہر کھاتا ہے مرجاتا ہے اور اگر اس کو کوئی زہر دیتا ہے تو بھی وہ مر جاتا ہے اسی طرح جو بچہ جس باپ کے جسم سے بنتا ہے اپنے سرچشمہ کی طاقتیں بھی حاصل کرتا ہے- اگر سرچشمہ کمزور ہے تو وہ بھی کمزور ہوتا ہے اگر سرچشمہ طاقتور ہے تو وہ بھی طاقتور ہوتا ہے- پس یہ عام قدرتی سبب ہی اس تغیر کا سبب ہے-

ادھورے رہ جانے والے کاموں کا اجر

چوتھا اعتراض یہ تھا کہ ایک کام کرتے کرتے انسان مرجاتا ہے وہ کام پورا نہیں ہوتا اس میں بے فائدہ محنت کرنی پڑتی ہے- اگر یہ پچھلے اعمال کی وجہ سے نہیں ہوتا تو کیوں خدا وہ کام کرتا ہے جس کا نتیجہ مرتب نہیں ہوتا؟

اسکا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو خاص حکم سے نہیں مارتا بلکہ انسان عام قانون قدرت کی نافرمانی سے یا عام قانون قدرت کی زد میں بلاجانے بوجھے آکر مرتا ہے- مگر اسلام یہ بتاتا ہے کہ اس صورت میں جس نیک کام کو کرتے کرتے انسان مرجاتا ہے اور وہ کام ادھورا رہ جاتا ہے وہ اس کے اعمال میں پورا لکھا جاتا ہے اور بغیر اس کام کے کرنے کے اس کا اجر مل جاتا ہے- مثلاً اگر کوئی نیکی کا کام کر رہا ہو اور قانونِ طبعی کے ماتحت اسے موت آجائے تو خدا اس کام کو اس کے حق میں لکھ دے گا- چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص جس نے بہت سے گناہ کئے تھے اس نے توبہ کرنی چاہی- اس نے ننانوے قتل کئے تھے ایک شخص سے اس نے پوچھا میں توبہ کرکے اپنے گناہ بخشوا سکتا ہوں یا نہیں؟ اس نے کہا نہیں- اس کو بھی اس نے قتل کر دیا پھر اس کو پشیمانی ہوئی اور خیال آیا شاید میری توبہ قبول ہو جائے- اسے معلوم ہوا کہ فلاں جگہ ایک شخص رہتا ہے اس سے پوچھنا چاہئے اس کی طرف چل پڑا مگر رستہ میں ہی مرگیا- حدیث میں آتا ہے کہ اس کے متعلق دوزخ اور بہشت کے فرشتوں میں جھگڑا ہوا- دوزخ کے فرشتے کہتے کہ اس نے توبہ نہیں

کی اس لئے اسے دوزخ میں ڈالیں گے اور بہشت کے فرشتے کہتے کہ چونکہ یہ توبہ کرنے کے لئے روانہ ہو چکا تھا اس لئے بہشت میں جانا چاہئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کہے گا کہ جاؤ دونوں طرفیں ناپو۔ پھر جس طرف وہ جا رہا ہو گا اس کو کھینچ کر چھوٹا کر دے گا اور اس طرح وہ بہشت میں چلا جائے گا[۵۹]۔

یہ ایک مثال ہے اور اس کے یہ معنی نہیں کہ واقعہ میں زمین کھینچ دی گئی تھی بلکہ یہ مراد ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس شخص کو توبہ کرنے والوں میں شامل کر لیا اور جنت کا وارث بنا دیا۔ پس جس عمل پر کوئی انسان مرتا ہے خواہ وہ ادھورا ہی رہے اس کا بدلہ اس کو مل جائے گا اور اس کا وہ کام ضائع نہیں جائے گا۔

مُردوں کی شہادت کہ تناسخ حق ہے

پانچواں اعتراض یہ تھا کہ مُردوں کی روحوں سے بلوا کر پوچھا گیا ہے تو انہوں نے بتایا کہ تناسخ حق ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات ہی درست نہیں کہ مُردوں کی روحیں اس طرح بلوانے سے آجاتی ہیں۔ انسان کے اندر ایک روحانی طاقت ہے جب کوئی شخص اس کو خاص طور پر استعمال کرتا ہے وہ عجیب عجیب نظارے دکھاتی ہے۔ اس کے ماتحت جو لوگ روحوں کے بلوانے کی طرف توجہ کرتے ہیں ان کو روحیں معلوم ہونے لگتی ہیں اور بعض دفعہ تو ان کی شکلیں نظر آنے لگتی ہیں لیکن حقیقتاً کوئی روح نہیں آتی کیونکہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ ایک ہی وقت میں مختلف جگہوں پر روحوں کو بلوایا گیا اور سب جگہ ایک ہی روح نے جواب دیا۔ اس طرح یہ بھی تجربہ ہوا ہے کہ ایک مذہب والے کو روح کچھ جواب دیتی ہے اور دوسرے مذہب والے کو کچھ جواب دیتی ہے حالانکہ اگر روح فی الواقع ہی آتی تو ایک وقت میں اگر ایک ہی روح کو کئی جگہ بلوایا جاتا تو ایک جگہ وہ آتی اور باقی جگہوں پر کوئی چیز نہ آتی اسی طرح چاہئے تھا کہ روحیں سب کو ایک ہی جواب دیتیں حالانکہ وہ مختلف جواب دیتی ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ یہ سب غلط فہمی کا نتیجہ ہے اپنے ہی خیال کو روح سمجھ لیا گیا ہے۔

تناسخ پر اعتراض

تناسخ کے ماننے والوں کے ان موٹے موٹے اعتراضوں کا جواب دینے کے بعد اب ہم خود تناسخ کے مسئلہ کو لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کیا اس پر کوئی اعتراض نہیں پڑ سکتا؟ یہ بالکل خلاف عقل ہے کہ ایک بات رد ہو جانے سے دوسری بات آپ ہی آپ ثابت ہو جائے۔ اگر ایک امر کی کئی توجیہہ ہو سکتی ہیں تو صرف ایک توجیہہ کے رد ہو جانے سے دوسری توجیہات رد نہیں ہو سکتیں۔ پس جب تک تناسخ کو رد نہ کیا جائے محض دوسرے

خیالات کو رد کرنے سے یا ان پر اعتراضات کرنے سے تناسخ ردّ نہیں ہو سکتا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ تناسخ کی کوئی دلیل بھی نہیں - تناسخ کے ماننے والوں کا سارا دارومدار اس امر پر ہے کہ وہ دوسرے خیالات پر اعتراض کر دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس سے ان کا عقیدہ ثابت ہو گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر غور کیا جائے تو یہ عقیدہ عقل سے اور مشاہدہ سے اور خود ہندوؤں کے عمل سے بالکل خلاف عقل ثابت ہوتا ہے - مثلاً

(۱) ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود اس کے کہ ہندو عقیدہ کے رو سے یہ دنیا ایک عذاب کا مقام ہے اور اس سے چھُٹ جانا نجات ہے - پھر بھی اگر ہندوؤں میں سے کوئی مرجائے تو اس پر افسوس کرتے ہیں اور روتے ہیں حالانکہ اگر یہ دنیا ایک عذاب ہے اور اس کی گرفت سے نکل جانا اصل مقصد ہے تو چاہئے کہ مرنے والوں پر خوش ہوں کہ انہوں نے ایک منزل طے کر لی اور خصوصاً بچوں کی موت پر تو بہت ہی خوشی ہونی چاہئے کہ انہوں نے بلا کسی گناہ کے اپنی اس جون کو طے کر لیا مگر مرنے والوں پر ہندوؤں کا ماتم بتاتا ہے کہ وہ ایک طرف تو ان حوادث کو قانون قدرت کا اثر سمجھتے ہیں اور دوسری طرف تناسخ کی تائید پر اصرار کے ساتھ کمر بستہ ہیں جو خلاف عقل ہے -

(۲) ہندوؤں کے نزدیک نجات نام ہے اس جسم سے چُھٹنے کا کیونکہ سکھ دکھ جسم سے تعلق رکھتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جسم میں آنا ایک سزا ہے - چنانچہ ان کے عقائد سے ثابت ہوتا ہے کہ جب انسان ادنیٰ حالت میں آتا ہے تو جونوں کے چکر میں پھنستا ہے اور جب ترقی کرتا ہے تو اس چکر سے آزاد ہو جاتا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ باوجود اس کے وہ اولاد کی خواہش کرتے ہیں - گویا ایک طرف تو اس دنیا میں جیو کا آنا سزا کا موجب سمجھتے ہیں اور دوسری طرف اس امر کی خواہش رکھتے ہیں کہ ان کے گھر بھی کچھ قیدی آویں گویا وہ اولاد کی خواہش کر کے جیوؤں کو دکھ میں ڈالنا چاہتے ہیں -

(۳) پھر تناسخ کے عقیدہ پر یہ اعتراض پڑتا ہے کہ پہلی دفعہ روحوں کو جسم میں کیوں داخل کیا گیا تھا - یہ کونسا انصاف تھا کہ ان کو جونوں کے چکر میں پھنسا کر تکلیف دی جاتی؟ ہندو یہ نہیں کہہ سکتے کہ پہلے انسان پیدا کیا گیا تھا جو اچھی حالت ہے کیونکہ ان کے عقیدہ کے رو سے خواہ انسان بنایا جائے خواہ کچھ بنایا جائے روحوں کی اطمینان کی حالت جونوں سے الگ ہو کر سکھ دکھ کے احساس سے بچ جانا ہے - پس اس دنیا میں خواہ انسان بنا کر بھیجا جائے یہ ایک عذاب ہے اور دکھ ہے یہ دکھ بلا وجہ کیوں دیا گیا؟

(۴) تناسخ کے عقیدہ کو مان کر ایک مشکل یہ پیش آجاتی ہے کہ کیا خدا تعالیٰ نے سب روحوں کو پہلے ہی موقع پر اکٹھا انسانوں کی جون میں بھیجا تھا یا آہستہ آہستہ دنیا میں بھیجا؟ اگر کہو کہ پہلے ایک ہی دفعہ سب روحوں کو انسان بنا کر بھیجا پھر جو گنہگار تھے ان کو جانور بنا دیا تو اس کو تاریخ غلط ثابت کر رہی ہے۔ تاریخ بلاشک و شبہ اس امر کو ثابت کرتی ہے کہ انسانی نسل دنیا میں بڑھتی جاتی ہے جو آج سے ہزار سال پہلے آبادی تھی اب اس سے بہت زیادہ ہے۔ وہ ہزار سال پہلے کی آبادی سے زیادہ تھی پس یہ بات تو درست نہیں ہو سکتی۔ اگر کہا جائے کہ آہستہ آہستہ روحوں کو دنیا میں بھیجا جاتا ہے تو یہ انصاف کے خلاف ہے کیونکہ پہلی دفعہ دنیا میں آنے والی سب روحیں یکساں ہونی چاہئیں مگر جب دنیا کا سلسلہ جاری ہو گیا تو ماننا پڑے گا کہ کوئی امیر کے گھر میں پیدا ہوگی کوئی غریب کے گھر میں اور یہ بقول ہندو صاحبان ظلم ہوگا۔

(۵) تناسخ کے عقیدہ کو مشاہدہ باطل کرتا ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں اس قدر جانور ہیں کہ اگر انسان بنا دیا جائے تو زمین پر تل دھرنے کی جگہ نہ رہے بلکہ اگر ان کی لاشیں اوپر نیچے رکھ دی جائیں۔ تب بھی میلوں میل اونچے لاشوں کے پہاڑ بن جائیں۔ پس اگر یہ صحیح ہے کہ پہلے یہ سب روحیں انسان تھیں پھر گناہ کی وجہ سے جانور بن گئیں تو اس قدر آدمی دنیا میں رہ کیونکر سکتے تھے ان کو تو کھڑے ہونے کو بھی جگہ نہیں مل سکتی تھی۔ اگر کہو کہ آہستہ آہستہ دنیا میں آئے تو اس کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے کہ پھر برابری نہ رہتی اور وہی بے انصافی کا جواب آریہ مذہب پر آجاتا جو وہ دوسروں پر لگاتے ہیں۔

(۶) سائنس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا پر حیوان اس طرح پھیلے ہیں کہ پہلے ادنیٰ جانور بنے پھر ان سے اعلیٰ پھر انسان بنا اور یہ بات عقل کے مطابق ہے کیونکہ ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ تمام قانون قدرت ایک ارتقائی تدریج ہے۔ پس تناسخ کا عقیدہ اس حقیقت کے خلاف ہونے کے سبب سے باطل ہے۔ ہم ڈارون تھیوری کے قائل نہیں ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ انسان کسی اور جانور سے بن گیا ہے مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ زمین نے آہستہ آہستہ ایسی صفائی اختیار کی کہ اس میں انسان رہ سکے۔ پس ضرور تھا کہ پہلے ادنیٰ جانور پیدا ہوتے جو کثیف ہوا میں رہ سکتے اور اگر پہلے جانور ہوئے ہیں تو پھر تناسخ کا عقیدہ باطل ہے کیونکہ اس صورت میں ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ نے مکتی خانہ سے نکال کر پہلے روحوں کو جانور بنایا جو ظلم ہوگا۔

(۷) تناسخ کی ابتداء ہی تناسخ کو رد کرتی ہے کیونکہ یہ خیال کیا گیا ہے کہ گناہ کی وجہ سے دنیا

میں اختلاف پیدا ہوا کہ کوئی غریب بنا کوئی امیر' کوئی عقلمند بنا کوئی بے وقوف' کوئی بد صورت بنا کوئی خوبصورت لیکن جب ہم غور کرتے ہیں تو گناہ تفاوت اور اختلاف سے پیدا ہوتا ہے ایک شخص کے پاس ایک ایسی چیز نہیں ہوتی جو دوسروں کے پاس ہوتی ہے تو وہ اس کی خواہش کرتا ہے اور حسد یا لالچ میں مبتلاء ہو جاتا ہے پھر چوری وغیرہ میں مبتلاء ہو جاتا ہے پھر قتل وغیرہ کے جرم کا مرتکب ہوتا ہے یا زنا اور بدکاری میں مبتلاء ہوتا ہے۔ لیکن اگر پہلے سب انسان ایک سی شکل کے' ایک سی عقل کے' ایک سے مال کے' ایک سی عزت کے پیدا ہوئے تھے تو گناہ کیونکہ پیدا ہوا؟ کسی کو کسی کے خلاف جوش و غصہ پیدا کیونکر ہو سکتا تھا؟

(۸) آٹھواں اعتراض یہ ہے کہ اگر تناسخ درست ہے تو ماننا پڑے گا کہ جس قدر تکالیف انسان کو دنیا میں پہنچتی ہیں یہ سب پچھلے اعمال کی سزا اور ان کا بدلہ ہیں۔ اگر یہ درست ہے تو چاہئے کہ جو اس دنیا میں زیادہ مالدار ہو وہ پہلے جنم میں زیادہ نیک ہو اور جسے اس دنیا میں تکالیف پہنچیں وہ پچھلے جنم میں نہایت گناہ گار اور گندا ہو۔ جیسا کہ ہندوؤں کا خیال بھی ہے کہ بیوہ عورتیں اور اندھے اور لولے لنگڑے انسان اور غریب اور بھوکے مرتے لوگ پچھلے جنموں کی سزا بھگت رہے ہیں مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جس قدر لوگ دنیا کے مصلح گذرے ہیں خواہ ان کو نبی کہو' مأمور کہو' اوتار کہو' وہ سب لوگ بہت ہی تکالیف میں رہے۔ ہندوؤں کے بزرگوں رام چندر جی اور کرشن جی کو دیکھ لو ان کے راستہ میں سخت تکالیف آئیں۔ تناسخ کی رو سے ماننا پڑے گا کہ ان لوگوں کی پچھلے جنموں کی زندگی بہت بری تھی۔ مگر کیا کوئی عقلمند مان سکتا ہے کہ جس قدر لوگ دنیا کی اصلاح کے لئے آئے ہیں وہ سب کے سب پہلی زندگی میں برے لوگ تھے؟ عقل یہی فیصلہ کرے گی کہ وہ مسئلہ باطل ہے جو ان کو بد عمل قرار دیتا ہے یہ لوگ بد نہ تھے۔

(۹) ایک اعتراض یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ کئی قسم کے جانور دنیا سے مٹتے چلے جاتے ہیں اگر تناسخ صحیح ہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ بعض گناہ ہونے دنیا سے بند ہو گئے ہیں حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں گناہ نئے سے نئے نکلتے آتے ہیں۔

(۱۰) دسواں اعتراض یہ ہے کہ ہندو لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ ملک میں چارہ نہ رہنے کی وجہ سے اور گائیوں کو ذبح کر دینے کے سبب سے گائیں دنیا میں کم ہو گئی ہیں اور اس کا الزام گورنمنٹ پر دیتے ہیں۔ لیکن اگر یہ سچ ہے کہ تناسخ کے اثر کے نیچے بعض روحیں گائے کی جون میں آتی ہیں تو پھر لوگوں کے ذبح کرنے سے گائیں کم کیوں ہو جاتی ہیں؟ جب ان کے اعمال چاہتے

ہیں کہ وہ گائے کی شکل میں رہیں تو اول تو کسی کو ان کے ذبح کرنے پر قدرت ہی نہیں ہونی چاہئے اور اگر یہ قدرت ہو تو چاہئے کہ وہ پھر جلد سے جلد دوبارہ جنم گائے کی شکل میں لیں اور جس جگہ گائیں زیادہ ذبح ہوں وہاں گائیوں کی اولاد بہت بڑھ جائے اور جلدی جلدی بچے ہونے لگیں۔ مگر یہ درست نہیں جس قدر جانور ذبح کئے جائیں وہ اپنی مدت پوری کرنے کے لئے واپس نہیں آتے بلکہ کہیں غائب ہو جاتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ تناسخ کا عقیدہ بالکل عقل کے خلاف اور قانون قدرت کے مخالف ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس خلاف عقل عقیدہ کو مان کر اس کے ماننے والوں نے عجیب عجیب خلاف عقل باتوں کو تسلیم کیا ہے جس پر ایک عقلمند انسان سوائے افسوس کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ بدھوں میں سے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بدھ متعدد دفعہ مختلف جونوں میں اس دنیا میں آیا ہے۔ چنانچہ چار دفعہ اس نے برہما کا جنم لیا' بیس دفعہ اندر کا' ایک بار خرگوش کا' تراسی بار سنیاسی کا' اٹھاون مرتبہ بادشاہ کا' چوبیس مرتبہ برہمن کا' ایک بار قمار باز کا' اٹھارہ مرتبہ بندر کا' چھ بار ہاتھی کا' گیارہ مرتبہ ہرن کا' ایک مرتبہ کتے کا' چار بار سانپ کا' چھ مرتبہ چوہے کا' ایک بار مینڈک کا' دو مرتبہ مچھلی کا' پینتالیس بار وہ درخت بنا' دو مرتبہ سئور اور دو مرتبہ چور وغیرہ وغیرہ۔ یہ تاریخ بدھ جی کی جیسی قابل مضحکہ' قابل نفرت' قابل نفرین ہے خود ہی ظاہر ہے ایک نیک اور پاکباز بزرگ انسان کی نسبت اس قسم کی تاریک تاریخ منسوب کرنے کی جرأت صرف تناسخ کے عقیدہ نے دلوائی ہے ورنہ ہرگز ممکن نہ تھا کہ کوئی ایسی جرأت کرتا۔ ان لوگوں کو اگر کہا جائے تمہارا باپ سئور ہے تو فوراً لڑ پڑیں لیکن ایک مقدس بزرگ کو سئور بنانے سے نہیں شرماتے۔

کیا نجات مل جانے پر اعمال کی ضرورت نہیں رہتی

اب میں اس سوال کے متعلق کچھ بیان کرتا ہوں کہ کیا نجات مل جانے پر عمل چھوٹ جاتے ہیں۔ مثلاً جس طرح جب بیمار اچھا ہو جاتا ہے تو علاج چھوٹ جاتا ہے۔ کیا اسی طرح جو نجات حاصل کر لیتا ہے اس کو اعمال کی ضرورت نہیں رہتی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سوال سے بہت بڑا نقصان لوگوں کو پہنچا ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ اگر نجات مل جائے تو اسی دنیا میں عمل چھٹ جائیں گے۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ رشی چونکہ نجات یافتہ ہوتے ہیں اس لئے وہ خواہ کچھ کریں ان پر کوئی دوش نہیں ہوتا اور ہر بات ان کے لئے جائز ہو جاتی ہے۔ بعض نادان مسلمان کہتے ہیں ایک شریعت ہے اور ایک طریقت۔ شریعت کے چکر میں جو پڑا ہو

اس کے لئے ضروری ہے کہ عمل کرے۔ مگر جب طریقت حاصل ہو جائے تو پھر عمل کی ضرورت نہیں رہتی۔

اس سوال کا پہلے تو اسلامی جواب دیتا ہوں پھر عقلی جواب دوں گا۔ کہا جا سکتا ہے کہ جب اسلامی نقطہ نگاہ سے مانا گیا ہے کہ اس دنیا میں ہی نجات مل جاتی ہے تو پھر اعمال کی کیا ضرورت رہتی ہے؟ چنانچہ اباحتیوں نے اس امر کو مدنظر رکھ کر شریعت اور طریقت کی اصطلاحات نکالی ہیں۔ لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ سے کہا کہ آپ کو تو خدا تعالیٰ نے سب کچھ معاف کر دیا پھر آپ تہجد کی نماز میں اس قدر کیوں کھڑے ہوتے ہیں کہ آپ کے پاؤں سوج جاتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کیا میں خدا تعالیٰ کا شکر گذار بندہ نہ بنوں؟[۶۰] اس سے معلوم ہوا کہ عمل خدا تعالیٰ کے ملنے کے لئے ہی نہیں کئے جاتے بلکہ شکریہ کے طور پر بھی کئے جاتے ہیں۔ اور جب رسول کریم ﷺ جیسا انسان بھی جو سب نیکوں کا سردار ہے اعمال سے مستغنی نہیں ہوتا تو اور لوگ کس طرح مستغنی ہو سکتے ہیں؟

خدا کی حقیقت سے ناواقفیت

یہ خیال دراصل تین باتوں کے نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اول یہ کہ ایسے لوگ خدا تعالیٰ کی ذات کو نہیں سمجھتے اور اسے کوئی محدود چیز سمجھ لیتے ہیں اور یہ خیال کر لیتے ہیں کہ انسان پر ایک ایسا زمانہ بھی آتا ہے کہ اسے خدا مل جاتا ہے اور اسے کسی اور کام کی ضرورت نہیں رہتی۔ حالانکہ خدا کے ملنے کا یہ مطلب ہے کہ عرفان حاصل ہو اور عرفان کبھی ختم نہیں ہوتا بلکہ برابر بڑھتا چلا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ رسول کریم ﷺ کو بھی خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ کہو رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا[۶۱] اے میرے رب میرے علم کو اور بڑھا اور میرے عرفان کو اور ترقی دے۔ اور ہم تو دیکھتے ہیں کہ دنیا کے معمولی علم بھی ختم نہیں ہوتے پھر خدا تعالیٰ کی معرفت کس طرح ختم ہو سکتی ہے؟ ایک دفعہ ایک شخص آیا اور مجھ سے پوچھنے لگا اگر دریا کے پار ہونا ہو اور انسان کشتی میں سوار ہو اور کشتی کنارے پر پہنچ جائے تو پھر اسی میں بیٹھے رہنا چاہئے یا اتر جانا چاہئے؟ میں نے اس کا مطلب سمجھ لیا وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ اعمال بطور کشتی کے ہیں اور کنارہ خدا ہے جب خدا مل گیا تو پھر اعمال کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے اسے کہا اگر دریا کا پاٹ ختم ہونے والا ہو تو انسان کنارے پر پہنچ کر اتر جائے لیکن اگر دریا غیر محدود پاٹ کا ہو تو اگر وہ اترے گا تو ڈوبے گا یہ سن کر وہ پھر نہ بولا۔

پس چونکہ ہم اس ہستی کی تلاش میں ہیں کہ جس کا عرفان کبھی ختم نہیں ہوتا پھر اس کے

حصول کے لئے جو اعمال کئے جاتے ہیں ان کو چھوڑنے کا کیا مطلب؟ خدا تعالیٰ نے روح کو ابدی اسی لئے بنایا ہے کہ تا وہ یہ سمجھے کہ خدا کا عرفان کبھی ختم نہ ہوگا۔ روح کو خدا تعالیٰ ابدی زندگی دیکر کہے گا کہ میرا عرفان حاصل کر۔ مگر جب عرفان کبھی ختم نہ ہوگا تو روح کو پتہ لگے گا کہ ذات باری غیر محدود ہے ورنہ جو موجودہ علم انسان کو اللہ تعالیٰ کی نسبت ہے اس سے ان طاقتوں کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا جو اللہ تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں۔

اعمال کی حقیقت سے ناواقفیت

دوسری جہالت ان لوگوں کی یہ ہے کہ ایسے لوگوں نے اعمال کی حقیقت کو نہیں سمجھا۔ اعمال صرف خدا کو پالینے کے لئے ہی نہیں ہوتے بلکہ عبودیت کے اظہار اور اظہار شکریہ کے لئے بھی ہوتے ہیں۔ جس کو خدا مل گیا اور فرض کرلو کہ خدا کے عرفان کی حد اس نے معلوم کرلی اور اس حد کو پہنچ گیا تب بھی وہ اعمال چھوڑ نہیں سکتا کیونکہ پھر وہ شکریہ کے اظہار کے لئے عمل کرے گا۔ یہ ایسی ہی مثال ہے کہ ایک شخص اپنے شاگرد کو اپنا سارا علم پڑھا دے مگر شاگرد پھر بھی اس کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھے گا۔

اپنی حقیقت سے ناواقفیت

تیسری جہالت یہ ہے کہ ایسے لوگوں نے اپنی حقیقت بھی نہیں سمجھی۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ مخلوق ہر وقت تازہ غذا کی محتاج ہوتی ہے۔ عبودیت کے ذریعہ انسان عرفان کے مقام پر جب پہنچتا ہے تو پھر اسے یہ بھی ضرورت ہوتی ہے کہ اس مقام پر اپنے آپ کو قائم رکھے جیسے ایک مضبوط آدمی کو ضرورت ہوتی ہے کہ اپنی طاقت قائم رکھنے کے لئے غذا کھاتا رہے۔ پس جس طرح ایک انسان مضبوط ہو کر کھانا کھانا چھوڑ نہیں دیتا اسی طرح عرفان کے مقام پر پہنچ کر عبودیت کو چھوڑ نہیں سکتا۔ پس عبادت کبھی نہ چھوٹے گی نہ یہاں اور نہ وہاں۔ بلکہ وہاں زیادہ بڑھ کر عبودیت کا اظہار کیا جائے گا۔ ہاں دنیا ایسی جگہ ہے کہ جہاں انسان اس مقام سے گر بھی سکتا ہے اور اس میں ترقی بھی کر سکتا ہے مگر وہ ایسی جگہ ہے کہ وہاں اپنے مقام سے گرے گا نہیں اور بڑھتا ہی جائے گا۔

۱- الفاتحۃ : ۱تا۷ ۲-المؤمنون : ۲تا۱۲

۳- زبور باب ۵۱ آیت ۱۲ تا ۱۴ بائبل سوسائٹی انار کلی لاہور مطبوعہ ۱۹۹۴ء

۴- الاعراف : ۴ ۵-الانعام : ۹۴

۶- الفرقان : ۲۸

۷- Marconi Gslielmo (۱۸۷۴ء-۱۹۳۷ء) اطالوی موجد۔ پولونیا میں لاسلکی مواصلات کا نظام قائم کیا۔ ایتھر کی شعاعوں میکانیات پر قابو پایا اور عملی طور پر ثابت کیا کہ کس طرح ان شعاعوں کو پیدا کر کے فاصلہ پر لاسلکی مواصلات کیلئے استعمال کیا جا سکتا ہے ۱۹۰۹ء میں اس کی خدمات کے صلے میں طبیعات کا نوبل انعام دیا گیا۔..(اردو جامع انسائیکلوپیڈیا جلد ۲ صفحہ ۱۳۷۸ مطبوعہ لاہور ۱۹۸۷ء)

۸- Thomas Alva Edison (۱۸۴۷ء-۱۹۳۱ء) امریکن موجد۔ ابتدائی ایجادات میں خودکار برقی پیغام رسانی کا ٹرانسسٹر اور ریسیور اور ۱۸۷۹ء میں بلب ایجاد کیا۔ اس نے تیرہ سو (۱۳۰۰) مختلف ایجادات پیٹنٹ کرار کھی تھیں (اردو جامع انسائیکلوپیڈیا جلد ۱ صفحہ ۱۷۲ مطبوعہ ۱۹۸۷ء)

۹- مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۳۶۹

۱۰- متی باب ۲۶ آیت ۲۱، ۲۲ بائبل سوسائٹی انار کلی لاہور مطبوعہ ۱۹۹۴ء (مفہوماً)

۱۱- متی باب ۲۶ آیت ۴۷ تا ۵۰ بائبل سوسائٹی انار کلی لاہور مطبوعہ ۱۹۹۴ء

۱۲- ایوب باب ۱ آیت ۶ تا باب ۲ آیت ۹ بائبل سوسائٹی انار کلی لاہور مطبوعہ ۱۹۹۴ء (مفہوماً)

۱۳- التوبة : ۴۰

۱۴- بخاری کتاب الجهاد باب من علق سیفه بالشجر فی السفر عند القائلة

۱۵- البقرة : ۱۸۷

۱۶- مسلم کتاب السلام باب لکل داء دواء واستحباب التداوی

۱۷- الحجر : ۳ ۱۸- یونس : ۱۷ ۱۹- اٰل عمران : ۶۸

۲۰- متی باب ۴ آیت ۱- بائبل سوسائٹی انار کلی مطبوعہ ۱۹۹۴ء

۲۱- مریم : ۴۲

۲۲- الانفال : ۳۰ ۲۳- الاحزاب : ۳۴ ۲۴- محمد : ۳

۲۵- مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۴۴۳

۲۶- اٰل عمران : ۸۸ تا ۹۰ ۲۷- الزمر : ۵۴ ۲۸- اٰل عمران : ۳۲

۲۹- یونس : ۸، ۹ ۳۰- الذّٰریٰت : ۵۰ ۳۱- التین : ۷

۳۲- الذّٰریٰت : ۵۷ ۳۳- الفجر : ۳۰، ۳۱ ۳۴- الانبیاء : ۴۸

۳۵- القارعة : ۹، ۱۰ ۳۶- هود : ۱۰۷ تا ۱۰۹ ۳۷- الاعراف : ۱۵۷

۳۸- کنزالعمال جلد ۱۴ صفحہ ۵۲۷ روایت ۳۹۵۰۶ مطبوعہ حلب ۱۹۷۵ء میں اس روایت کے الفاظ یہ ہیں "یاتی علی جھنم یوم مافیھا من بنی ادم احد تخفق ابوابھا"

۳۹- بخاری کتاب التوحید باب قول اللہ وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربّھا ناظرہ

۴۰- بنی اسرائیل : ۷۳ ۴۱-المطففین : ۵

۴۲- مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۱۲۹

۴۳- اٰل عمران : ۱۳۶، ۱۳۷ ۴۴-حٰمٓ السّجدۃ : ۳۱

۴۵- مسند احمد بن حنبل جلد ۵ صفحہ ۲۶۳

۴۶- النساء : ۱۲۰، ۱۲۱ ۴۷-ھود : ۶۳ ۴۸- حٰمٓ السجدہ : ۳۲

۴۹- تذکرہ صفحہ ۱۹۹-ایڈیشن چہارم

۵۰- المومنون : ۹۶، ۹۷

۵۱- الاعراف:۱۷۶، ۱۷۷ ۵۲-الانعام:۱۶۳ ۵۳-الاعراف:۸، ۹ ۵۴-النساء:۹۶، ۹۷

۵۵- مسند احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۱۰۳ پر اس حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں "ان بالمدینۃ لقوماما سرتم مسیرا ولا قطعتم وادیا الا کانوا معکم فیہ قالوا یا رسول اللّٰہ وھم بالمدینۃ قال وھم بالمدینۃ جسھم العذر"

۵۶- التوبۃ : ۹۱ ☆۵۷-الحج : ۳۸

☆☆۵۷- ترمذی ابواب الزھد باب فی الصبر علی البلاء

۵۸- سیرت ابن ھشام عربی جلد ۲ صفحہ ۹، ۱۰ مطبوعہ مصر ۱۹۳۶ء

۵۹- مسلم کتاب التوبۃ باب توبۃ القاتل وان کثر قتلہ

۶۰- بخاری کتاب التھجد باب قیام النبیؐ اللیل حتی ترم قدما.....الخ

۶۱- طٰہٰ : ۱۱۹